جلد 8 شمارہ 1

جنوری تا اپریل 2015

چیلنج

ایڈیٹرز: عذرا طلعت سعید/صبیحہ حسن

... اب پیروں میں زنجیر نہیں

مزدور عورت، جاگیردار اور سرمایہ دار کا ظلم و استحصال باقی مزدوروں کے ساتھ برابر سے برداشت کررہی ہے لیکن اس دائرے میں پدر شاہی نظام جو مردوں کی طرف سے عورتوں کے لیے بنائے ہوئے اصول وضوابط پر مبنی ہے، کو شامل کرلیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت ان تین نظاموں کی چکی میں پس رہی ہے۔ جاگیرداری میں عورت ہر طرح کا استحصال مٹھی بھر اناج کے لیے برداشت کرتی ہے۔ دن بھر کچھ کھائے پیئے بغیر چاول کی فصل کی کٹائی کا معاوضہ صرف پانچ کلو چاول کی شکل میں اپنے بچوں اور گھر والوں کی بھوک مٹانے کے لیے حاصل کرپاتی ہے۔ جاگیرداری مشین کا سہارا لیتی ہے تو چاہے گندم کی کٹائی ہو یا آلو کی چنائی، مزدور عورت کی مزدوری کوڑیوں پر لے آتی ہے۔ ادھر پدر شاہی بھی عروج پر ہے کہ سخت سے سخت کام مردوں کے بجائے عورتوں سے لیا جاتا ہے۔ مرچوں کی تکلیف دے چنائی ہو یا کپاس کی کمرتوڑ چنائی، عورت سے ہی کروائی جاتی ہے۔ مال مویشی کی دیکھ بھال ہو یا کھیت کی رکھوالی، گھر کی عورت سے مزدوری تو بھرپور کروائی جاتی ہے پر نا اسے اجرت دی جاتی ہے اور نا ہی اس کی محنت کی قدر کی جاتی ہے۔

ایک طرف معاشی استحصال ہے تو دوسری طرف معاشرتی مظالم کی نا ختم ہونے والی داستانیں جو عورت کے وجود کو اس دنیا میں بھی جہنم کی تپش سے بخوبی آگاہ کرتی رہتی ہیں۔ کبھی چہرے اور جسم پر تیزاب سہہ کر اور کبھی خوراک اور تعلیم جیسے بنیادی حقوق سے محروم رہ کر دکھوں کے انبار میں خود کو ہی کھو دیتی ہے۔

پدر شاہی کے مظالم کو بغور پرکھیں تو اصل قصور وار پھر بھی جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مکروہ استحصالی رشتے ہی ہیں۔ فرسودہ رسوم اور تہذیب کے تنگ دائرے کو مزید تنگ کرنے میں جدید علم اور ٹیکنالوجی نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ مشینی دور تعلیم اور علم کے روشن دریچے کھول کر انسان کو ریت و رسم سے آزاد کرتا، تعلیم عام کرتا، پرسکون روزگار اور بہتر معیار زندگی فراہم کرتا، وسائل کی جنگ اور اس پر قبضے کے لیے پسماندہ علاقوں کو مزید تاریکی میں دھکیل رہا ہے۔

سائنسی تحقیق کی ہر نئی ایجاد چاہے وہ جینیاتی بیج ہو یا ایگرو فیول، سب کا بنیادی جز تو زراعت ہی فراہم کرتا ہے۔ آج گنے کی کاشت سے بے شمار دولت کمائی جارہی ہے۔ کسان، مزدور سمجھتا ہے کہ وہ تو صرف گنا اگا رہا ہے لیکن یہ مکار جاگیردار، سرمایہ دار اور ان سے جڑے ہوس کے مارے سیاست دان گنے کی کاشت سے ایک طرف بجلی تو دوسری طرف ایتھنول/ایگرو فیول جیسی مہنگی ترین اشیاء پیدا کررہے ہیں۔ مزدور کسان کی بے تحاشہ کمرتوڑ مشقت کوڑیوں کے مول خریدی جاتی ہے اور ان کے ''مقدر'' میں بھوک و افلاس اور مہنگائی ڈال دی جاتی ہے۔ جبکہ جاگیردار سرمایہ دار، سیاستدان، افسر شاہی طبقے کو اپنے ساتھ ملا کر خود عیش وعشرت کی زندگی جیتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام خود بحران کا شکار ہو کر اس کوشش میں ہے کہ وسائل پر قبضے کے لیے ایسے قوانین رائج کرے کہ نہ مقامی آبادیاں زمین پر اپنا اختیار رکھ سکیں اور نا ہی بیج جیسے بنیادی پیداواری جز کو سنبھال سکیں۔ اس سونا اگلنے والی زمین پر آباد صدیوں پرانی آبادیوں کو ڈاکو کہہ کر لمحوں میں بے دخل کردیا جاتا ہے۔ مزدور و کسان احتجاج کرتے ہیں تو ان کے خلاف قانون سازی کرکے مجرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب کسان اگر بیج بھی رکھے گا تو اسے مجرم بنا کر قانون کے کٹھرے میں کھڑا کردیا جائے گا۔ اس بڑھتے ہوئے ظلم وستم کی داستانیں دنیا کے ہر کونے سے آرہی ہیں۔ مزدور کے لیے نا دیہات چھوڑے ہیں نا شہر، نا اجرت چھوڑی ہے نا روزگار اور نا ہی خوراک۔

دنیا کی چھ کروڑ سے زیادہ آبادی اس ظلم کا جواب دینے کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ جب قانون ہی انصاف دینے سے قاصر ہو، جب مجرم کو عزت دار اور عزت دار کو مجرم بنا دیا جائے تو پھر اس نظام کو چکنا چور کردینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس میں شک بھی نہیں کہ آج دنیا بھر کے مزدور و کسان، عوام اکھٹے ہو کر ہر استحصالی رشتے کو توڑنے کے لیے پرعزم نظر آتے ہیں!

فہرست مضامین

کسانوں کی خودمختاری یا کمپنیوں کی خودمختاری...2
سیڈ ترمیمی بل 2014: چیئرمین سینٹ کو خط....4
پدرشاہی نظام..........................7
زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی.......15
کشمیر اور گلگت بلتستان میں مال مویشی....23
چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا.....26
عالمی زمینی قبضے.......................34
بات تو سچ ہے مگر.......................40

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکریٹریٹ: اے-1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

کسانوں کی خودمختاری یا کمپنیوں کی خودمختاری[1]

تحریر: عذرا طلعت سعید

16 مارچ، 2015 کو قومی اسمبلی نے بیج کا ترمیمی بل 2014 منظور کرلیا جبکہ اس بل کی سینٹ سے منظوری ابھی باقی ہے۔ خوش قسمتی سے حالیہ دنوں میں جینیاتی ٹیکنالوجی کے حوالے سے بہت سی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں جو پاکستانی ایوان بالا (سینٹ) کے لیے اس سیڈ ایکٹ کے فائدے، نقصانات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے منظور یا مسترد کرنے کے لیے مددگار ہوسکتی ہیں۔ قومی اسمبلی سے اس بل کی منظوری کے صرف چار روز بعد ہی عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے ایک محکمے انٹرنیشنل ایجنسی فار ریسرچ ان کینسر (IARC) کی نئی تحقیق سامنے آئی۔ IARC (آئی اے آر سی) کا کہنا ہے کہ گلائی فوسیٹ (glyphosate) انسانوں میں کینسر کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بیان ایک تسلیم شدہ عالمی میڈیکل جنرل لین سیٹ (Lancet) میں 20 مارچ، 2015 کو شائع ہوا۔[2] یہ بیان اس رپورٹ کا ایک خلاصہ ہے جو آئی اے آر سی کے جلد شائع ہونے والے شمارے (monograph) کی جلد نمبر 112 میں شائع ہوگا۔ آئی اے آر سی کی خلاصہ رپورٹ میں پیش کیے گئے کے کچھ نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

آئی اے آر سی کے مطابق گلائی فوسیٹ اچھی بری تمام جڑی بوٹیاں تلف کرنے والی (Broad Spectrum) دوا ہے جو آج کل تمام جڑی بوٹی تلف کرنے والی ادویات کے مقابلے سب سے زیادہ تیار ہورہی ہے۔ گلائی فوسیٹ زراعت، جنگلات، شہری اور گھریلو سطح پر 750 مختلف مصنوعات میں استعمال کی جاتی ہے۔ گلائی فوسیٹ سے محفوظ جینیاتی فصلوں کی اقسام کی ترقی کی وجہ سے اس کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے۔ فصلوں پر چھڑکاؤ کے دوران گلائی فوسیٹ ہوا، خوراک اور پانی میں پایا گیا ہے۔

گلائی فوسیٹ مونسانٹو کی جڑی بوٹیوں کے خاتمے کی دوا راؤنڈ اپ ریڈی (Roundup Ready) میں استعمال کی جاتی ہے جسے ان جینیاتی فصلوں پر چھڑکا جاسکتا ہے جو گلائی فوسیٹ کے خلاف مزاحمت کی حامل ہوں۔

گلائی فوسیٹ انسانوں اور جانوروں کی صحت کے لیے خطرناک ہے پھر بھی مونسانٹو نے ایک بار پھر عالمی ادارہ صحت کی اس رپورٹ کو مسترد کردیا۔ یہ ہوتا رہا ہے کہ مونسانٹو ہر سائنسی تحقیق جس میں جینیاتی فصلوں کو خطرناک قرار دیا جاتا ہے مسترد کردیتی ہے۔[3]

سیڈ ایکٹ 2014 کے حوالے سے فیصلہ کرنے کے لیے پاکستانی سینٹ کے لیے یہ خبر انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ دو دہائیوں سے دنیا بھر میں عوامی جماعتیں، کسان تنظیمیں اور کئی مستند سائنسی ادارے حکومتوں کو کہتے رہے ہیں کہ وہ اس نئی ٹیکنالوجی کے استعمال پر حفاظتی اصولوں (Precautionary Principle) کو اپنائے[4] جس کے مطابق کوئی بھی نئی ٹیکنالوجی اس وقت تک استعمال نہ کی جائے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا استعمال انسانی صحت اور ماحول کے لیے محفوظ ہے۔ مگر مونسانٹو جیسی دیوہیکل کمپنیاں حکومتوں کی جانب سے پائیدار زراعت پر مبنی پالیسی اور خاص کر ایسی پالیسی جو کمپنیوں کے مفادات کے بجائے چھوٹے کسانوں کے معاشی مفادات کا تحفظ کرتی ہوں، میں مسلسل رکاوٹ بنتی ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جینیاتی فصلیں، جینیاتی بیج اور دیگر جینیاتی مصنوعات مسلسل کئی اطراف سے دباؤ کا سامنا کررہی ہیں۔ عوامی گروہوں، کسان تنظیموں، انسان دوست، کسان دوست اور ماحول دوست سائنس دانوں کو کامیابی بھی حاصل ہورہی ہے۔ اس حوالے سے جنوری 2015 میں یورپی یونین میں منظور کیے گئے قانون کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جس کے مطابق رکن ممالک کو انفرادی طور پر اپنے ملک میں جینیاتی فصلوں کی پیداوار کی اجازت دی گئی ہے۔[5] اصل میں ایسا اس لیے ہوا کہ کئی یورپی ممالک خصوصاً فرانس اور جرمنی کے عوام نے اس حوالے سے ایک مستحکم نقطہ نظر اپنایا۔ ان کے خیال میں جینیاتی خوراک انسانی صحت اور ماحول کے لیے انتہائی خطرناک ہے اور وہ ایسی مصنوعات استعمال کرکے خود کو اس خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ اگر یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک جینیاتی فصلوں کی مخالفت کررہے ہیں تو کیا پاکستانی سینٹ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ایسی ٹیکنالوجی کے فروغ کے بارے میں سوچیں جوان کے اپنے عوام کے لیے نقصاندہ ہے؟

اس کے علاوہ سینٹ کے لیے یہ نقطہ بھی اہم ہے کہ پاکستان میں بائیوسیفٹی کمیٹی فعال نہیں جس کی وجہ سے ملک میں جینیاتی بیجوں کے منظوری کا کوئی قانونی طریقہ کار نہیں۔ 18 ویں ترمیم کے بعد یہ ایک صوبائی معاملہ ہے مگر صوبوں نے اس ذمہ داری کو پوری کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حال ہی میں شائع ہوئی ڈان کی ایک خبر کے مطابق محکمہ برائے تحفظ ماحولیات کے سابق ڈائریکٹر جنرل آصف شجاع نے کہا ہے کہ ملک میں جینیاتی فصلوں کی محفوظ جانچ کے لیے مہارت دستیاب نہیں۔[6]

پچھلے سال لاہور ہائی کورٹ نے مرکزی حکومت کو احکامات دیے تھے کہ کپاس اور مکئی کے جینیاتی بیجوں کے استعمال کے لیے لائسنس اس وقت تک دینا بند کردیں جب تک ملک میں ایک ایسا قانونی ڈھانچہ موجود نہ ہو جو نئے طریقوں کی جینیاتی جاندار مصنوعات (organisms) کی جانچ پڑتال کرنے کا اہل ہو۔ خیال رہے کہ اس حکم سے بی ٹی کپاس کی 23 اور بی ٹی مکئی کی 14 نئی اقسام پر بھی اثر پڑا جنہیں مارچ 2014 میں منظور کرلیا گیا تھا۔ ڈان کی خبر مزید نشاندہی کررہی ہے کہ جینیاتی مکئی کی اقسام میں MIR 162 (مائیر 162) اور MON 810 (مون 810) بھی شامل تھیں جنہیں چین اور یورپی یونین میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

مزید یہ کہ موجودہ ڈائریکٹر جنرل محکمہ برائے تحفظ ماحولیات ڈاکٹر محمد خورشید

نے جینیاتی فصلوں کو ''وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار'' قرار دیا ہے۔[7] اسی طرح کا بیان دفتر خارجہ نے دیا کہ پاکستان سمجھتا ہے جینیاتی بیج قومی سلامتی اور تجارت کا معاملہ ہے۔[8] اس میں کوئی شک نہیں کہ بیج کے حوالے سے نئے قوانین پر یہ اقدامات عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلیو ٹی او) کے ذہنی ملکیت کے معاہدے (TRIPs) پر عملدرآمد کے لیے ہیں جسے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے منافع کو تحفظ دینے کے لیے زبردستی تیسری دنیا کے ممالک پر مسلط کیا۔ اس عمل میں سب سے آگے امریکہ ہے جس کا مقصد زرعی ادویات اور بیج کی جینیاتی کمپنیوں کے ذہنی ملکیت کے حقوق کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ پچھلے چیلنج میں امریکی امدادی ایجنسی یو ایس ایڈ پر ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا جس میں امریکی جینیاتی بیجوں اور دیگر مصنوعات کے لیے منڈی کھولنے کے طریقوں پر تفصیلی معلومات اور تبصرہ فراہم کیا گیا ہے۔[9]

پاکستان میں کئی غیر سرکاری تنظیموں، کسان تحریکوں اور اداروں نے ملک میں جینیاتی بیج متعارف کرنے کے خلاف ایک اصولی موقف اختیار کیا ہے۔ حال ہی میں تقریباً 50 کسان تنظیموں اور این جی اوز کی طرف سے چیئرمین سینٹ کو لکھے گئے ایک خط میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ سینٹ اس سیڈ ایکٹ 2014 کو مسترد کرے اور ایسا بل لائے جو ملک میں بیج کی خودمختاری اور چھوٹے اور بے زمین کسانوں کا تحفظ کرے جو بلاشبہ اس ملک کا سب سے بڑا پیداواری طبقہ ہے۔[10] یہ موقف صرف ماحولیات اور صحت سے متعلق خطرات کی بناء پر نہیں جو یورپی ممالک کی عوام اور پاکستانی حکومتی افسران کا ہے بلکہ بیج پر کسانوں کے مشترکہ حق ملکیت کے حوالے سے ہے جو صدیوں کی مشترکہ محنت پر مشتمل ہے جسے خطے کے لاکھوں چھوٹے کسانوں نے زمین پر ہر قسم کے موسمی حالات میں لاکھوں اقسام کے جینیاتی وسائل کو پروان چڑھایا اور محفوظ کیا ہے۔ ٹرپس کے قانون کے تحت لاگو کیے جانے والے بیج قوانین امریکی سامراجی حکومت کے دباؤ پر افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیاء کے کئی ممالک میں عوامی خواہشات کے خلاف زبردستی نافذ کیا جارہا ہے جو سیاسی، معاشی، ماحولیاتی اور معاشرتی اثرات لیے ہوئے ہے۔ ایک طرف ماحول اور صحت پر اثرات ابھی تک مکمل طور پر سامنے نہیں آئے ہیں، کیونکہ سائنسی تحقیق کو منافع خور کمپنیاں رد کردیتی ہیں، دوسری طرف پیٹنٹ شدہ بیج کسان کو مزید تنگ دستی اور محتاجی کی طرف دھکیل دے گا۔ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اس قانون کے تحت کسان اپنے دیسی بیج کو محفوظ نہیں کر پائے گا، نہ ہی دوسرے کسانوں سے تبادلہ کرپائے گا اور اگر کرے گا تو پورے ملک کو خوراک پیدا کرکے فراہم کرنے والا کسان مجرم قرار دیا جائے گا۔ یہ کالا قانون ظلم و ناانصافی کی انتہا ہے۔

آج صرف مونسانٹو جیسی کمپنیاں ہی نام نہاد نئے بیج تیار کرنے کی اہل ہوگئیں ہیں جن کا بنیادی جینیاتی مواد کسانوں کا ہی جمع کردہ تھا۔ خصوصاً تیسری دنیا کے کسانوں کا جیسے کہ پاکستان۔ ساہیوال میں ہڑپہ کا عجائب گھر ہمارے خطے اور ملک کی وسیع اور صدیوں پرانی زرعی تاریخ کی گواہی دیتا ہے۔ یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ اس عجائب گھر میں کئی ہزار سال پرانے بیج دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ہمارے عوام، ہمارے کسانوں اور ہمارے ملک کا ثقافتی ورثہ ہے۔ ایسے میں حکومت کیوں منافع خور بیج کمپنیوں خاص کر دیوہیکل غیرملکی زرعی اور بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں کے منافع کے تحفظ کے لیے بیج کے نئے قوانین لاگو کرنے کی اجازت دے رہی ہے؟ اس قانون کے حوالے سے خود پنجاب سیڈ کارپوریشن کے ایک سابق اہل کار محمد بوٹا سرور کہتے ہیں کہ یہ قانون ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے بنایا گیا ہے۔[11] نئی ٹیکنالوجی صرف اس وقت قابل قبول ہوسکتی ہے جب وہ عوامی مفاد میں ہو، کسانوں کے مفاد میں ہو، عوامی اور قومی خودمختاری میں اضافے اور پائیدار ترقی کے لیے ہو۔

امید ہے پاکستانی سینٹ جب اس نئے بیج کے قانون کے فوائد اور نقصانات پر بحث کرے گی تو عوامی خواہشات و امنگوں کو فیصلہ سازی کے عمل میں ایک رہنما اصول کے مانند مدنظر رکھے گی تاکہ بیج کا قانون جس کا مقصد ہے کہ یہ ملک کے سب سے فعال پیداواری شعبہ خصوصاً چھوٹے اور بے زمین کسانوں میں خوشحالی لاسکے حقیقت میں اپنے ہدف حاصل کرسکے۔

حوالہ جات

1۔ اس مضمون کا کچھ حصہ ڈان اخبار کے فنانس اور بزنس صفحہ پر، 13 مارچ، 2015 کو شائع ہوا تھا۔

2. The Lancet Oncology. "Carcinogenicity of tetrachlorvinphos, parathion, malathion, diazinon, and glyphosate." March 20, 2015. Accessed from http://www.thelancet.com/journals/lanonc/article/PIIS1470-2045(15)70134-8/fulltext

3. Monsanto. "Monsanto comments (Update 11/1/2012): Long term toxicity of a Roundup herbicide and a Roundup-tolerant genetically modified maize." Accessed from http://www.monsanto.com/products/documents/productsafety/seralini-sept-2012-monsanto-comments.pdf; GMOSeralini. "Why this study now?." Accessed from http://www.gmoseralini.org/faq-items/why-this-study-now/

4. Brac, Robert Ali and Seuret, Franck. "Brave new seeds: the threat of GM crops to farmers." Zed Books, 2000.

5. BBC. "EU changes rules on GM crop cultivation." BBC News, Europe, January 13, 2015. Accessed from http://www.bbc.com/news/world-europe-30794256

6. Shahid, Jamal. "Minister concerned over GM crops in Pakistan." DAWN, April 7, 2015.

7. Ibid.

8. Shahid, Jamal. "Court stops regulator from issuing licenses for 'modified' seeds." DAWN, May 14, 2014. Accessed from http://www.dawn.com/news/1106195

9۔ سعید، عذرا طلعت۔ ''بین الاقوامی ادارہ یو ایس ایڈ کی پاکستان میں کارکردگی''۔ چیلنج، مئی تا دسمبر، 2014، صفحات 25-14۔

10. Ilyas, Faiza. "50 NGOs urge Senate to block bill on seeds." DAWN, April 5, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1173928

11. "New seed law might create foreign monopoly." The Express Tribune, March 20, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/856027/new-seed-law-might-create-foreign-monopoly/

سیڈ (ترمیمی) بل 2014 کے خلاف عوامی گروہوں اور تنظیموں کا چیئرمین سینٹ کو ایک عوامی خط

جیسا کہ پچھلے مضمون میں بتایا گیا کہ 16 مارچ، 2015 کو قومی اسمبلی پاکستان نے سیڈ (ترمیمی) بل 2014 کو منظور کرلیا۔عوامی گروہوں اور کسان گروہ جو کہ بیج کے لیے اس نئے قانون کے خلاف اس کے پیش کیے جانے اور اس سے پہلے سے بیج کے لیے ملکیتی حقوق کے لیے احتجاج کر رہے تھے نے پاکستان سینٹ چیئرمین کو ایک خط بھیجا۔ یہاں پر اس خط کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

چیئرمین، سینٹ آف پاکستان،

اسلام آباد، پاکستان

30 مارچ، 2015

محترم جناب:

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سیڈ (ترمیمی) ایکٹ 2014 قومی اسمبلی میں 16 مارچ، 2015 منظور ہو چکا ہے۔ آپ کی توجہ بہ حیثیت نئے تقرر شدہ چیئرمین سینٹ کسانوں اور عام شہریوں کے ایک اہم مسئلے موجودہ سیڈ ایکٹ 1976 کی تبدیلی کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ترامیم کو حتمی شکل دینے کے طریقہ کار اور ترمیمی ایکٹ کے اجزا دونوں پر ہمیں کئی اختلافات اور خدشات ہیں جو ہم وجوہات کے ساتھ نیچے بیان کر رہے ہیں۔

عملی طریقہ کار

قومی اسمبلی نے بغیر کسی مباحثہ کے خاموشی سے سیڈ (ترمیمی) ایکٹ 2014 منظور کرلیا باوجود اس کے کہ اصل عبارت میں بہت سے مسائل تھے۔ نہ ہی بل کے مندرجہ جات عوام کے سامنے پیش کیے گئے اور نہ ہی فریقین یعنی کسان گروہوں سے کوئی معنی خیز مشاورت کی گئی۔

مندرجات

ذہنی ملکیت

یہ ایکٹ بیج پر ذہنی ملکیت کے حقوق (Intellectual Property Rights/IPR) کی اجازت دیتا ہے جو پاکستان کے کسان گروہ کے قومی اخلاق، سماجی عمل اور بیج کی روایت کے خلاف ہے۔ ذہنی ملکیت کو بیج کے شعبے میں 1995 میں عالمی ادارہ برائے تجارت (World Trade Organization/WTO) کے قیام اور ذہنی ملکیت کے معاہدے، ٹریڈ ریلیٹڈ ایسپیکٹس آف انٹی لیکچوئل پراپرٹی رائٹس (TRIPs) کے بعد پہچان ملی۔ پاکستان WTO (ڈبلیو ٹی او) کا بانی رکن ہے۔کسی بھی ڈبلیو ٹی او کے رکن کی طرح اسے بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے TRIPs (ٹرپس) قوانین میں نرمی کے لیے اپنا قانونی حق استعمال کرے۔ ٹرپس نے ڈبلیو ٹی او کے رکن ممالک کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے زمینی حقائق کے مطابق پودوں کی اقسام کی حفاظت کے لیے ایک سوئی جینرس سسٹم بنائیں۔ ڈبلیو ٹی او کے اس حکم کے بیس سال بعد ملٹی نیشنل سیڈ کارپوریشنز کی اجارہ داری کے لیے پیش کیے گئے مطالبات جو ٹرپس کے مسودے کو تشکیل دینے میں بھی شامل تھیں، کو پورا نہیں کرنا چاہیے۔

بیج پر قانون سازی امریکی ایما پر ہورہی ہے امریکی محکمہ زراعت اور تجارتی ثالث زرعی ٹیکنالوجی کے حوالے سے مسلسل اپنی کمپنیوں کے ذہنی ملکیت کے حقوق کے عدم تحفظ کی نشاندہی کر رہے ہیں جیسے کہ جینیاتی بیج جس کا کاروبار وہ پاکستان سمیت پورے ایشیا میں کرنا چاہتے ہیں۔

ذہنی ملکیت کے حقوق پر ایک جامع قانون کا مسودہ، پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ بھی 2007 سے زیر غور ہے۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ پلانٹ بریڈرز رائٹس بل بھی قومی اسمبلی سے منظور ہو جائے گا۔ اس بل پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جینیاتی ٹیکنالوجی

امریکہ اور اس کے زیر سایہ بایوٹیک کمپنیوں کے دباؤ میں آکر دنیا میں بیج کے شعبے میں جینیاتی کاریگر (Genetic Engineering/GE) کو بمشکل 30 ممالک نے اپنایا ہے۔ نہ صرف یورپی یونین کے ممالک بلکہ اس کی عوام نے بھی جینیاتی فصلوں کو نہیں اپنایا کیونکہ وہ اس مصنوعی ٹیکنالوجی کے انسانی صحت، ماحولیاتی نظام، سماجی اور اقتصادی ناموافق اثرات سے خوفزدہ تھے۔ پاکستان میں ذہنی ملکیت کے قانون کے مطالبہ میں پیش پیش عالمی امریکی کمپنی مونسانٹو ہے جو جینیاتی کپاس یعنی بی ٹی کپاس کے بیج پر مکمل ذہنی ملکیت کے حقوق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ جینیاتی مکئی بھی ملک میں کئی مقامات پر تجرباتی طور پر اگائی جا رہی ہے۔ بہت سی بڑی کمپنیوں کے دباؤ میں آکر ترمیم شدہ سیڈ ایکٹ 2014 پاکستان کے کسانوں پر تھوپا جارہا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت کسانوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ ایک لائسنس یافتہ کمپنی یا اس کے مختیار سے بیج خریدیں اور یہ کام انہیں ہر نئی فصل کے موسم میں کرنا ہوگا۔

بائیوسیفٹی کی ذمہ داری

بائیوسیفٹی سے مراد ہے کہ زندہ جینیاتی اجسام (جی ایم اوز) جب مقامی ماحول میں متعارف کرائے جائیں تو اس ماحول میں موجود نباتات اور حیوانات کے علاوہ انسانی صحت ان نئے اجسام کے مضر اثرات سے مکمل طور پر محفوظ ہوں۔ پاکستان کارٹی جینا پروٹوکول آن بائیوسیفٹی کا رکن ہے۔ اس بین الاقوامی قانون کے تحت ہمیں بائیوسیفٹی پر مکمل کار بند ہونا لازم ہے اور ساتھ ساتھ قومی سطح پر بائیوسیفٹی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچہ بھی فراہم کرنا لازم ہے۔

کسانوں کی آزادی

یہ انتہائی افسوسناک ہے کہ اس قانون کے تحت کسانوں کا بیج کو محفوظ کرنے، فروخت کرنے اور تبادلہ کرنے کا حق ختم ہوجائے گا۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ کسان آپس میں تقریباً 75 سے 80 فیصد بیج کا تبادلہ کرتے ہیں۔

بڑی کمپنیوں کا احتساب

ترمیمی سیڈ ایکٹ میں بیج کے چھوٹے کی کوئی ضمانت موجود نہیں اور اگر کمپنی کا بیج متوقع نتائج نہیں دیتا تو اس صورت میں بھی کمپنی کے خلاف کسی قانونی کاروائی کی کوئی ترکیب نہیں ہے۔ دوسری طرف کسانوں کو اس ایکٹ کے تحت دھمکی دی گئی ہے کہ اگر انہوں نے بیج ذخیرہ کیے، فروخت کیے یا تبدیل کیے تو انہیں بھاری جرمانہ اور جیل بھی ہوسکتی ہے جو سراسر ناانصافی ہے۔ نئے ایکٹ کے یہ شرائط ملک میں غذائی عدم تحفظ میں اضافہ کریں گی۔ بیج کی قیمتوں میں اضافے کا بوجھ بھی چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو اٹھانا پڑے گا جو پہلے ہی زرعی مداخل مثلاً کیمیائی کھاد، زرعی ادویات وغیرہ کی بہت زیادہ قیمتوں سے پریشان ہیں۔

بیج کی خودمختاری

سیڈ ایکٹ 2014 کسانوں کو غیر ملکی کمپنیوں کا محتاج بناتا ہے جو ملک کی ترقی اور خود مختاری میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ حکومت کو ہرگز کسانوں کو ان کے بنیادی حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

ترمیم شدہ سیڈ ایکٹ میں بیج کی درآمد پر زور دیا گیا ہے۔ نئی ترامیم کے تحت اگر قانون تبدیل کیا گیا تو بھارت سے جہاں بین الاقوامی بیج کی کمپنیاں مستحکم ہو چکی ہیں اور ایسے کئی ممالک سے ہائبرڈ اور جینیاتی فصلوں کی اقسام کی ملک میں بھرمار ہو جائے گی۔ ماضی میں جینیاتی بی ٹی کپاس کے بیج پاکستان میں غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعہ بھارت سے آتے رہے ہیں۔ اگر بیج کی دیسی پیداوار میں کسانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو یہ مقامی طور پر بیج کے حصول کے لیے ایک محفوظ ذریعہ ہوگا جو موسمی بحران کے خلاف ہمارا ضامن بھی ہوگا۔

جناب چیئرمین، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ ایکٹ منظور ہوگیا تو ملک اپنی بقاء کا ایک اہم ستون کھو دے گا۔

صوبائی خودمختاری

زراعت ایک صوبائی موضوع ہے جس پر قانون سازی کا حق کسانوں، ان کے نمائندوں اور شہریوں کے مشورے کے بغیر قومی اسمبلی کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ بطور ایک آئینی و قانونی ماہر آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس عمل نے آئین کے (اٹھارویں آئینی ترمیم) ایکٹ 2010 کے مقاصد کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس ایکٹ نے پاکستان کے موجودہ آئین میں قوانین کی فہرست کو ختم کرتے ہوئے یہ واضح اشارہ دیا تھا کہ پارلیمنٹ کو فہرست زدہ موضوعات پر صوبوں کے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل نہیں۔

ہمارے مطالبات

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس ایکٹ کو جس نے کسانوں کے بنیادی حقوق اور آزادی کو مجروح کیا ہے، پاکستانی قوم کی فلاح، ملک میں بیج اور خوراک کے مستقبل کے لیے موثر طریقے سے روک دیا جائے۔

چاروں صوبوں کے مفادات کی محافظ ہونے کی حیثیت سے سینٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کی انتہائی اہم پیداواری قوت کی حفاظت کرے۔ ایک تجربہ کار، باصلاحیت عوام دوست سیاست دان ہونے کی حیثیت سے ہمیں آپ سے کافی امیدیں ہیں۔ اگر آپ کی رہنمائی میں ایک عوامی صلاح مشورے کی ابتدا ہو تو ہم مندرجہ ذیل مدد فراہم کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔

- کسانوں کی زبانی گواہی۔
- عوامی سائنسدانوں کی شہادت۔
- مختلف ممالک کے تجربات۔
- متعلقہ تحریری مواد۔
- ایکٹ کے حوالے سے ہماری تجاویز۔

اس انتہائی اہم معاملے میں آپ کی خاص توجہ کی توقع کے ساتھ

بصد احترام تسلیمات

دستخط:

پاکستان کسان مزدور تحریک، روٹس فار ایکوٹی، سسٹینبل ایکشن ایگریکلچر گروپ

(ساگ) اسلام آباد، اثر ریسورس سینٹر لاہور پنجاب، انسٹی ٹیوٹ آف وومن اسٹڈیز لاہور پنجاب، لوک سانجھ فاؤنڈیشن اسلام آباد، سنگی ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن ایبٹ آباد خیبر پختون خواہ (کے پی کے)، روشنی ترقیاتی تنظیم گھوٹکی سندھ، سوجھلا فار سوشل چینج ملتان پنجاب، پیپلز پیس الائنس لاہور پنجاب، آنگن سوسائٹی مظفر گڑھ پنجاب، سوسائٹی فار ہیومن ایڈوانسمنٹ اینڈ جسٹ ریفارمز گجراں والا پنجاب، ہیومن یونٹی مومنٹ ہری پور کے پی کے، سینٹر فار سوشل چینج حیدرآباد سندھ، جاب کریٹنگ ڈیولپمنٹ سوسائٹی چارسدہ کے پی کے، آس ڈیولپمنٹ سوسائٹی لیہ پنجاب، دامام وومن ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن راجن پور پنجاب، سندھ رورل ڈیولپمنٹ سوسائٹی (ایس آر ڈی ایس) ٹمیاری سندھ، ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ نیٹ ورک (ڈی آئی این) شکار پور سندھ، سوفی سوشل ویلفیئر ایسوسی ایشن کنڈھ کوٹ سندھ، آئیڈیاز ڈیولپمنٹ سوسائٹی سوات کے پی کے، گلگت بلتستان رائٹرز فورم گلگت، یونائیٹڈ رورل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن لوئر دیر کے پی کے، ہولیسٹک انڈر اسٹانڈنگ فار جسٹیفائڈ ریسرچ اینڈ ایکشن مینگورہ کے پی کے، گل ویلفیئر ایسوسی ایشن گھوٹکی سندھ، سیوائی فاؤنڈیشن سچل سوشل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن میرپور ماتھیلو سندھ، بھٹائی سوشل واچ ایڈوکیسی خیرپور سندھ، کمیونٹی ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن جیکب آباد سندھ، اراڈرا لاڑکانہ سندھ، بیسک ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن دادو سندھ، انسٹی ٹیوٹ آف سوشل چینج ٹنڈو محمد خان سندھ، سندھ کمیونٹی فاؤنڈیشن حیدرآباد سندھ، آرٹ فاؤنڈیشن تھرپارکر سندھ، وومن ویلفیئر ایسوسی ایشن، وائس کوئٹہ، ہاری سجاگ نیٹ ورک شہدادکوٹ سندھ، این جی اوز ڈیولپمنٹ سوسائٹی شہدادکوٹ سندھ، اویر چھاچرو سندھ، دھرتی ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن نوشہرو فیروز سندھ، پاکستان کسان اتحاد نیٹ ورک سندھ، پاکستان کسان اتحاد نیٹ ورک بلوچستان، پیپلز نیٹ ورک آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر سندھ، زراہی ویلفیئر ترقیاتی سوسائٹی بلوچستان، مہرڈار انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشن بلوچستان، ایس او جے ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ سوسائٹی بلوچستان، آزات فاؤنڈیشن بلوچستان، ہیلتھ اینڈ رورل ڈیولپمنٹ بلوچستان۔

حوالہ جات: زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی اجرت

1. Ward, Catherine. "Six Innovations lifting the World's agricultural workers out of poverty." Accessed from http://blogs.worldwatch.org/nourishingtheplanet/six-innovations-lifting-the-worlds-agricultural-workers-out-of-poverty/

2. Sarwar, Farhan and Abbasi, Sattar, Abdus. "An in-depth analysis of women's labor force participation in Pakistan." IDOSI Publications, 2013. Accesed from http://www.idosi.org/mejsr/mejsr15%282%2913/6.pdf

3. Dommati, Devender and Chittedi, Krishna, R. "Socio-economic conditions of agricultural women labour in Andhra Pradesh: a case study of Karimnagar district." Volume 2, Issue 3. March, 2011. Accessed from https://www.academia.edu/656163/Socio-Economic_Conditions_of_Agricultural_Women_Labour_in_Andhra_Pradesh_A_Case_Study_of_Karimnagar_District

4. Adnan, Imran. "Pakistan scores lowest In female wage employment." Pakistan Today, August 28, 2011. Accessed from http://www.pakistantoday.com.pk/2011/08/28/business/pakistan-scores-lowest-in-female-wage-employment/

5. Ameer, Mehak. "Pakistani women earn 38.5% less than men: report." The Express Tribune, December 5, 2014. Accessed from http://tribune.com.pk/story/802222/pakistani-women-earn-38-5-less-than-men-report/

6. Mahajan, Kanika and Ramaswami, Bharat." Caste, female labor supply and the gender wage gap in India: Boserup, revisited," Indian Statistical Institute, Delhi. October 2012. Accessed from http://www.iza.org/conference_files/worldb2012/mahajan_k8185.pdf

7. Afzal, Anila. "Women In agriculture: results from a survey of Okara district of Pakistan Punjab. "Vol 23, No 1-2, 2010. Accessed from http://www.cabi.org/gara/FullTextPDF/2011/20113078994.pdf

8. Begum, Razia and Yasmeen, Ghazala. "Contribution of Pakistani women in agriculture: productivity and constraints." Vol. 27, No. 4, 2011. Accessed from file:///C:/Users/TOSHIBA%20ZONE/Downloads/CONTRIBUTION%20OF%20PAKISTANI%20WOMEN%20IN%20AGRICULTURE.PDF

9. Sarwar, Farhan and Abbasi, Sattar, Abdus. "An in-depth analysis of women's labor force participation in Pakistan."

10. Government of Pakistan, "Pakistan employment trends 2011." Statistics Division, Islamabad, 2011. p. 14.

11. Government of Pakistan, Finace Division Economic Advisor's Wing. "Pakistan Economic Survey 2006-07." Petiwali Book Corporation, 2007, p. 197.

12. Ibid.

13. Hurst, Peter. "Agricultural workers and their contribution to sustainable agriculture and rural development." October, 2005. Accessed from ftp://ftp.fao.org/docrep/fao/008/af164e/af164e00.pdf

14. Hussain, Maliha, H. et al. "Bonded labour in agriculture: a rapid assessment in Sindh and Balochistan, Pakistan." Working paper. International Labour Office, Geneva, March 2004. Accessed from http://www.ilo.org/global/topics/forced-labour/publications/WCMS_082026/lang--en/index.htm

15. ibid. p. 6.

16. Sindh Board of Investment. "RICE." Accessed from http://www.sedf.gos.pk/pdf/sectors/rice.pdf

17. Government of Pakistan, "Cotton Crop." PAK-SCMS BULLETTIN, Volume IV, Issue 1, Serial No. 37, 1-January-2014, p. 3. Accessed from http://www.suparco.gov.pk/downloadables/Monthly%20Bulletin%20%202014.VoL-4%20Issue-1%20jan%2014%20SR.pdf

18۔ ایڈیٹر صبیحہ حسن، ''حال احوال''، روٹس فار ایکوٹی، صفحہ 7، 2014۔

19۔ ایضاً، صفحہ 37۔

20۔ ایضاً، صفحہ 7۔

پدرشاہی نظام

تحریر: رابعہ وسیم

پدرشاہی ایک ایسا نظام ہے جو مردوں نے مردوں کے لیے بنایا ہے۔ پدرشاہی کے لغوی معنی ہیں ''باپ کی حکومت'' مگر حقیقتاً اس اصطلاح کا استعمال معاشرے میں مردوں کے تسلط کو ظاہر کرتا ہے۔[1] یہ ایک ایسا نظریہ یا سوچ ہے جو مرد کو عورت پر برتری دیتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو عورت کو ماتحت یا محکوم کا درجہ تو دیتا ہے مگر اسے حاکم یا پیشوا کا درجہ نہیں دیتا۔ مختلف ممالک اور علاقوں میں، پدرشاہی کے انداز مختلف ہیں مگر مرد کا غلبہ یا تسلط پوری دنیا میں آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

ایڈرینن رچ نے پدرشاہی کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ایک خاندانی، سماجی، نظریاتی سیاسی نظام جس میں ایک مرد طاقت سے، براہ راست دباؤ یا رسمی اور روائتی قانون اور زبان، رواج، تمیز، تعلیم اور کام کی تقسیم میں حدود کا تعین کرتا ہے کہ عورت کو کیا کردار ادا کرنا ہے یا نہیں کرنا ہے جہاں عورت ہر جگہ مرد کے نیچے اس کے سائے تلے نظر آتی ہے۔[2]

آج مسئلہ یہ نہیں کہ عورت کیا کرتی ہے اور کب، مسئلہ یہ ہے کہ اس کے کام کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے اور کس کے پاس کام کو اہمیت دینے کا حق ہے۔ مسئلہ دراصل اس پیمانے میں ہے جو مرد طے کرتا ہے۔[3]

پاکستان میں گزشتہ کچھ دہائیوں سے عورتیں دیہی یا شہری، مختلف گروہوں میں جمع ہوتی ہیں اور مرد کے تسلط کو سمجھنے اور اس سے نکلنے کے طریقوں پر بحث و مباحثے کے علاوہ عملی جدوجہد کے ذریعہ بھی اپنے لیے برابری کا مقام حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔ حقوق نسواں کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف تعلیمی پروگرام اور ورکشاپ بھی منعقد کیے جاتے ہیں جس سے عورتوں میں شعور و آگہی بڑھ رہی ہے، جو ان کی خود مختاری کی منزل کی جانب مثبت قدم ہیں۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ مرد کا رویہ مسلسل منفی اور ناشائستہ ہے۔

دنیا کے امیر ترین ملک امریکہ میں بھی عورت کی حالت اتنی پائیدار نہیں جتنی کہ ہونی چاہیے۔ جاپان کے علاقے سینڈائی میں عورت کو کسی بھی حالت میں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں خاص طور پر جب گھر میں کوئی معزور، ضعیف یا بچہ ہو۔ طوفان آئے یا زلزلہ اسے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے گھر پر ہی رہنا ہوتا ہے۔[4]

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں قدرتی آفات میں مرنے والی عورتوں اور بچوں کی تعداد مردوں سے چودہ گناہ زیادہ ہے۔ کینیڈا جو ایک ترقی یافتہ ملک ہے، کی ایک پارلیمنٹ کے ایک رکن لیری میلر (Larry Millar) نے ایک مسلمان عورت کو شہریت کا حلف لینے کے دوران صرف اس وجہ سے کہ وہ نقاب پہنے ہوئی تھی تضحیک آمیز لہجے میں کہا کہ ''اسی جہنم میں جاؤ جہاں سے تم آئی ہو''۔[5]

آج بھی دنیا میں ہر تین میں سے ایک عورت کسی نہ کسی قسم کے تشدد کا شکار ہے جو ایک انتہائی خطرناک امر ہے۔[6]

بدقسمتی سے ہم ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جو پدرشاہی نظام سے بہت زیادہ مرعوب ہے۔ یہ نظام مرد کی حکمرانی اور عورت کے استحصال کا دوسرا نام ہے۔ عورت کے استحصال کی تین بنیادی اشکال ہیں، سماجی، معاشی اور سیاسی۔ سماجی طور پر تعلیم کے حصول کی ممانعت، آنے جانے پر پابندی، ذاتی شناخت کا نہ ہونا، معاشی لحاظ سے عورت کو یا تو سرے سے کام کرنے کی اجازت نہ ہونا یا پھر اس کے کام کی کم یا کوئی اجرت کا نہ ہونا اور سیاسی لحاظ سے عورت کو کسی قسم کے فیصلے کی آزادی نہ دینا، یہ سب استحصالی دائرہ کار میں شامل ہیں۔

ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان اس وقت دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے جو عورتوں کے لیے انتہائی خطرناک ملک ہے۔[7] پاکستان میں بے شمار عورتیں اس وقت استحصال کا شکار ہیں۔ انسان کا دنیا میں آنے کے بعد پہلا حق محبت کا ہوتا ہے، مگر پیدائش کے ساتھ ہی عورت کے اس حق کو نفرت یا حقارت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان، چین، جاپان سمیت بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں پیدائش سے پہلے ہی لڑکیوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو کام فخر سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر کے کیا جاتا تھا وہ ہی کام آج ہسپتالوں میں زچگی کے بارہ یا تیرہ ہفتوں بعد خاموشی سے ہو جاتا ہے۔[8]

سماجی استحصال

سماجی استحصال عورت کی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کا سامنا عورت دنیا میں آ کر سب سے پہلے کرتی ہے۔ پدرشاہی نظام عورت کو قانونی اور غیر رسمی طور پر بہت سے عوامل میں معاشرے کا پابند کرتا ہے۔ پدرشاہی نظام کے کچھ شعبہ جات پر پڑنے والے اثرات مندرجہ ذیل ہیں۔

تعلیم

مذہب کے نام پر عورت کو تعلیم فراہم نہ کرنا بھی غیر رسمی استحصال کی شکل ہے، حالانکہ ہمارے دین میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اگر پاکستان کی بات کی جائے تو صرف 32 فیصد افراد عورت کو تعلیم دلانے کے حق میں ہیں اور اسے ایک بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اے کرپس کے اس قول سے عورت کے لیے تعلیم کی اہمیت واضح ہوتی

ہے کہ ''ایک مرد کو تعلیم دلائیں تو ایک شخص تعلیم یافتہ ہوگا اور ایک عورت کو تعلیم دلائیں تو پورا خاندان تعلیم یافتہ ہوگا''۔9

پاکستان میں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا قانونی حق حاصل ہے، مگر بہت سے دیہی علاقوں میں لڑکیوں کو اس ضمن میں سخت مخالفت کا سامنا ہے، جس کے نتیجے میں انہیں مختلف قسم کے تشدد کا سامنا ہے مثلاً تیزاب پھینکنا، مار پیٹ، جلایا جانا وغیرہ عورتوں کی تعلیم حاصل نہ کرسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قانونی طور پر پاکستان میں لڑکیوں کی شادی کی عمر 16 سال ہے جس کی وجہ سے آٹھویں کے بعد کی تعلیم انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔10

خصوصاً ثانوی تعلیم سے عورتوں کی محرومی میں پاکستان کی سرکار کا بھی ہاتھ ہے۔ دیہات کی سطح پر اکثر مقامات پر لڑکیوں کے لیے ثانوی اسکول ہی موجود نہیں ہیں۔ پدرشاہی نظام میں ایسے ضوابط بنادیے جاتے ہیں کہ لڑکیاں لڑکوں کے اسکول میں داخلہ نہیں لے سکتیں اور معاشرہ بھی انہیں لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

صحت

پدر شاہی نظام میں عورت کو عموماً مرد کے مقابلے کم خوراک دی جاتی ہے خیال یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ مرد کی کمائی سے گھر چلتا ہے اس لیے اس کا خوراک پر زیادہ حق ہے۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر سال ہر ایک منٹ میں ایک عورت زچگی کے دوران مر جاتی ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے تخلیقی عمل کے حق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہر جوڑے کو یہ حق ہے کہ وہ انفرادی طور پر یہ فیصلہ کرے کہ اسے کتنے بچے چاہیں اور کتنے وقفے سے، عورت اپنی صحت اور خواہش کے مطابق بچہ پیدا کرے۔ یہ اس کا بنیادی حق ہے۔11 پاکستان میں عورتوں میں آئرن کی کمی (iron deficiency) اور خون کی کمی (anemia) بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ پاکستان میں ہر پانچویں عورت خون کی کمی کا شکار ہے، صرف 30 فیصد عورتیں متوازن خوراک لیتی ہیں، باقی 70 فیصد کا رجحان، خاندان کے مردوں کے لیے اپنی غذا کی قربانی ہے جو انڈے، گوشت، دودھ اور اس سے بنی اشیا، پھل وغیرہ مرد کے سامنے پیش کرنے کو ترجیح دیتی ہیں اور خود چائے روٹی کھاتی ہیں، زیادہ چائے اور کم گوشت کے استعمال کی وجہ سے عورتیں خون کی کمی کا شکار ہیں۔12 صحت کے حوالے سے عورتیں اپنے لیے بہت کم وقت نکال پاتی ہیں تقریباً ہر سال 40,000 عورتیں چھاتی کے کینسر کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتیں خوراک کی کمی کی وجہ سے سانس کا رُکنا، اختلاج قلب، سر درد، سُستی، یاداشت کی کمی، تھکاوٹ اور ایسی کئی بیماریوں کا شکار ہیں۔13

رسمی ضوابط

پدر شاہی نظام کی کچھ ایسی بظاہر نظر نہ آنے والے حدود ہیں جو عورت کی زندگی کو اذیت میں مبتلا رکھتی ہیں۔ پاکستان میں مرد کی عزت یا غیرت اس کی عورت کے ناتواں کندھوں پر ایک ایسا بوجھ ہے جو عورت کی ہر ابھرتی ہوئی خواہش کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ مرد کی عزت کی رکھوالی عورت اپنے اوپر ہر قسم کی پابندیوں کی قیمت پر کرتی ہے۔ اونچی آواز پر پابندی، آنے جانے، چلنے پھرنے، بول چال یہاں تک کہ اس کی ہر نقل و حرکت پر بہت گہری نگاہ رکھی جاتی ہے اور اسے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے شاید اعمیلائن پینکرسٹ کا کہنا ہے کہ ''ہمیں انسانی نسل کے آدھے حصے یعنی عورت کو آزاد کر دینا چاہئے''۔14

غیرت کے نام پر قتل

عورتوں پر کئی وجوہات کی بنا پر الزام لگتے ہیں، جیسے تعلیم کے لیے باہر جانا، پسند کی شادی کرنا، طلاق مانگنا، کسی مرد کو پسند کرنا یا تعلق رکھنا، ان سب باتوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور یہ سارے فعل مرد کی عزت سے جڑے ہوتے ہیں۔ گھر کے حاکم جو عورت کو اپنا غلام سمجھتے ہیں، اگر صرف یہ محسوس کریں کہ شاید گھر کی عورت ان افعال میں سے کسی ایک میں ملوث ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ 27 مئی 2014 کو لاہور ہائی کورٹ کے سامنے ایک حاملہ عورت کو پتھر مار مار کر اس کے سگے باپ نے قتل کر دیا۔ پولیس کو دیے گئے بیان میں لڑکی کے باپ نے بتایا کہ اس کی بیٹی نے پسند کی شادی کی تھی جو اس کے لیے باعث شرمندگی تھی۔15

تیزاب سے حملہ

تیزاب پھینکنا ایک انتہائی گھناؤنا عمل ہے جو اکثر اوقات عورتوں کے چہرے پر پھینکا جاتا ہے جس سے نہ صرف چہرہ بلکہ ہڈیاں تک بہت بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ نیو یارک ٹائمز کے رپورٹر نیکولیس ڈی کرسٹوف کے مطابق پاکستان میں تیزاب سے حملے کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے جس میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے۔ اندازاً ان حملوں کی تعداد تقریباً 400 سے 750 سالانہ ہے اور اس کی وجوہات میں شادی سے انکار سے لے کر مذہبی بنیادیں تک شامل ہیں۔16

جنسی تشدد

صنفی امتیاز انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے محسوس کرتا ہے۔ عموماً یہ سماجی تفریق جنسی امتیاز سے شروع ہوتی ہے اور عمر کے آخری حصے تک جاری رہتی ہے۔ بچے کی پیدائش

سے شروع ہونے والی یہ تفریق انہیں علیحدہ ہونے کا ہی نہیں بلکہ ایک کو دوسرے پر برتری کا احساس بھی دلاتی ہے جس کی مثال لڑکی کے لیے گلابی اور لڑکے کے لیے نیلے رنگ یا لڑکی کے لیے معمولی اور لڑکے کے لیے مہنگے کھلونوں کے انتخاب سے بھی ملتی ہے۔ اس تفریق سے مرد کی نفسیات میں برتری کا احساس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے عورت کو صرف عیش وعشرت یا لذت کا سامان سمجھتا ہے اور اس پر کسی بھی قسم کے تشدد کو غلط نہیں سمجھتا۔ زنا بالجبر کے خلاف سینٹ میں ایک بل پاس ہوا ہے جو تشدد کا نشانہ بننے والی عورتوں کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔[17] 2002 میں مختاراں مائی نے زنا بالجبر کی شکار پاکستانی خواتین کے لیے آواز اٹھائی جو حقیقتاً ایک دلیرانہ قدم تھا۔[18] عورتیں سماجی ردعمل سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوتی ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی مضبوط قانونی تحفظ نہیں ہوتا لہٰذا اس حوالے سے پدر شاہی نظام کا قانونی امتیاز واضح ہے کیونکہ اول تو مقدمات درج ہی نہیں ہو پاتے اور جو درج ہو بھی جاتے ہیں وہ کسی مناسب انجام تک نہیں پہنچتے۔

ہمارے ملک میں کئی روایتیں ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کو ذاتی ملکیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ خاندانی جھگڑوں اور وراثتی مسائل میں عورت کو شئے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں عورتوں پر مختلف رسموں و رواج اور طریقوں سے ظلم ڈھایا جاتا ہے۔ ان فرسودہ روایات میں ونی، کاروکاری اور سوارہ جیسی رسمیں شامل ہیں۔

ونی

پشتو زبان کا لفظ ہے جو خون کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ رواج چار سو سال پرانا ہے۔ اس رواج میں گھر کے مرد کے کسی جرم کی سزا اس کے گھر کی کسی بھی عورت کو زبردستی شادی کی صورت میں ملتی ہے۔ مثلاً خون کا بدلہ لڑکی کی شادی سے اتارا جاتا ہے۔ اگر لڑکی کے جوڑ کا مرد نہ ہوتو اس کی شادی متاثرہ خاندان کے سربراہ سے کر دی جاتی ہے۔[19]

کاروکاری

عورت پر جھوٹا یا سچا الزام لگاکر اسے غیرت کے نام پر قتل کرنا کاروکاری یعنی کالا لڑکا اور کاری یعنی کالی لڑکی اگر کسی بھی لڑکے یا لڑکی کو بات کرتے، ہنستے مسکراتے یا جنسی روابط رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اسے فوراً قتل کر دیا جاتا ہے۔ مرد تو کسی نہ کسی قسم کا تاوان دے کر خود کو بچا لیتے ہیں مگر عورت اس ظالم روایت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ سندھ میں تقریباً 95 فیصد کاروکاری کے کیس جھوٹے ہوتے ہیں۔[20]

سوارہ

یہ ایک قبائلی اور دیہاتی رسم ہے۔ جس میں صلح کے بدلے گھر کی عورت کو امن کی ضمانت کے طور پر کسی اور کی سپردگی میں دے دیا جاتا ہے۔ 2005 کے کرمنل ایکٹ کے مطابق سوارہ کے مجرم کو کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس سال کی سزا کا سختی سے حکم ہے۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار روپے جرمانے کی بھی سزا ہے۔[21]

ان مخصوص رسموں کے علاوہ عورت کئی حوالوں سے جسمانی تشدد کا سامنا کر رہی ہے۔ مار پیٹ کے علاوہ جلاکر مار دینے کے واقعات بھی کم نہیں۔ پاکستان میں اس سال 220 عورتوں کو جلایا گیا جن میں سے چالیس جل کر مر گئیں۔[22] ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق صرف سندھ میں پچھلے تین ماہ میں تشدد کے 421 واقعات سامنے آئے لیکن صرف 18 کی ایف آئی آر درج ہوئی۔ پاکستان میں ابھی تک کوئی واضع اعداد و شمار نہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ عورتوں کو اپنے حقوق کا اندازہ ہے بھی یا نہیں۔ اس وقت گھریلو تشدد بھی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ سروے 2012 کے پہلے چھ ماہ کے خوفناک نتائج بتاتے ہیں کہ پاکستان میں 4,585 تشدد کے مقدمات درج ہوئے۔ آج بھی پوری دنیا میں تقریباً ایک ارب عورتیں گھریلو تشدد کا شکار ہیں۔[23]

معاشی استحصال

معاشی لحاظ سے طبقاتی فرق بھی عورتوں کی زندگی پر بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہر طبقہ کی عورت الگ قسم کے استحصال کا شکار ہوتی ہے، صرف اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ معاشرہ عام طور پر آمدنی کے حساب سے تین معاشی درجات میں تقسیم ہوتا ہے۔ امیر، درمیانہ اور غریب طبقہ۔ امیر طبقے کی رسائی زندگی کے تمام وسائل تک ہوتی ہے، پڑھے لکھے ماحول اور بہتر وسائل کی وجہ سے یہاں پر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے شعور اور معاشی استحکام سے اختیارات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں پر عموماً صرف پدری سوچ اور روایات ہی اس کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔

درمیانے طبقے میں بہتر وسائل حاصل کرنے اور امیر طبقے میں شامل ہونے کی جنگ جاری رہتی ہے اس طبقے میں لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے کم تعلیم دلوائی جاتی ہے اور لڑکی پر ''لوگ کیا کہیں گے'' کی بنیاد پر بہت سی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اس طبقے کی عورت ابہام کا شکار رہتی ہے اور اپنی زندگی کے فیصلوں کے لیے مرد پر انحصار کرتی ہے۔ کم تعلیم اور عدم اعتماد کی وجہ سے عورت کی معاشی ترقی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ہم غریب طبقے کی بات کریں تو بدقسمتی سے یہ طبقہ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے اور یہاں پر وسائل کی شدید کمی ہے۔ اس طبقے میں پدر شاہی کی جڑیں بہت مظبوط ہیں، ہر قسم کا اختیار صرف مرد کے ہاتھ میں ہے اور عورت کو مرد صرف بوجھ یا ملکیت سمجھتے ہیں، ان کی اپنی کوئی شخصیت نہیں اور جب شخصیت ہی نہیں تو معاشی حیثیت کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر کام کے حوالے سے دیکھا جائے تو

اس طبقے کی عورت ہر طبقے سے بڑھ کر معاشی کام میں حصہ لے رہی ہوتی ہے لیکن یہ سارے کام کم درجے اور ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اس طبقے کی عورت کام تو ضرور کر رہی ہوتی ہے مگر اس کی آمدنی پر زیادہ تر اختیار اسکے گھر والوں کا ہوتا ہے۔

پاکستان ایک نیم جاگیردار ملک ہے جہاں 70 فیصد عوام دیہات میں رہتے ہیں۔ اس لیے جاگیردارانہ روایات ملک کے ہر نظام پر حاوی ہیں۔ ترقی پسند عورت جاگیرداری میں پدرشاہی نظام کے فروغ پر کچھ یوں تنقید کرتی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں عورتوں کے پاس معاش حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہیں۔ روزگار میں عورتوں کی شمولیت مردوں کے مقابلے صرف 50 فیصد ہے جبکہ جنوبی ایشیا میں 20 فیصد اور عرب ریاستوں میں 16 فیصد ہے۔[24]

جاگیرداری کی تین معاشی صورتیں ہیں جو نہ صرف پدرشاہی کو بڑھاوا دیتی ہیں بلکہ بالائی سانچے میں بھی لکیر کے فقیر والے رویے کو تقویت دیتی ہے۔ اول تو زمیندار طبقہ ظالمانہ طریقے سے بے زمین اور غریب مزدور عورتوں کا استحصال کرتا ہے یعنی ان کے کام کو کوئی حیثیت نہیں دیتا، دوئم، جاگیردارانہ نظام میں زرعی معیشت پیداوار کو چھوٹے پیمانے پر رکھا گیا جس نے گھریلو معیشت کی بنیاد رکھی اور پھر اس گھریلو معیشت کو ہی پیداوار اور استعمال کی اکائی مانا گیا جس کی وجہ سے پدرشاہی بنیادوں پر ایسا خاندان بنا جس میں عورتوں اور بچوں کو ماتحت رکھا گیا اور اسی ماتحتی نظام کو پختہ کیا گیا۔ سوئم، جاگیردارانہ نظام میں اکثریت کے پاس چھوٹے رقبہ پر مشتمل زمین تھی جس کی وجہ سے عورتیں اپنے جیسی دوسری عورتوں کے مسائل سے ناواقف رہیں جس کی وجہ سے ان میں یکجہتی نہ ہو پائی کیونکہ پیداوار ایک اکائی کی صورت گھر تک محدود تھی۔[25]

جاگیرداری میں ایک بڑا مسئلہ عورت کے پیداواری حصے کا ہے۔ ہمارے ملک میں پدرشاہی اور جاگیرداری نظام جب ملتے ہیں تو عورت کو معاشی لحاظ سے بہت کمزور کر دیتے ہیں۔ اس نظام میں عورت معاشی کام میں حصہ تو لیتی ہے لیکن اس کے کام کو حیثیت نہیں ملتی۔ یعنی اس کو مزدور نہیں مانا جاتا مزید یہ کہ وہ جو بھی کام کرے اس کی اجرت اس کے گھر کے مرد، باپ، بھائی، شوہر یا بیٹے لے جاتے ہیں۔ انٹر پریس سروس کے مطابق عورت، دنیا کی آدھی سے زیادہ خوراک بوتی، کاشت کرتی اور کاٹتی ہے، براعظم ایشیا میں 50 فیصد عورتیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کام کرتی ہیں مگر ان کے کام کی کوئی حیثیت نہیں۔[26]

سرمایہ داری نظام میں عورت کا معاشی مقام مرد کے مقابلے میں کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے تعلیم کے مواقع مرد کے مقابلے کم ملتے ہیں اور اگر وہ تعلیم حاصل کر بھی لے تب بھی نوکری یا مزدوری سے زیادہ اسے گھریلو ذمہ داریوں میں الجھا دیا جاتا ہے۔ جیسے گھر کے بزرگوں اور بچوں کا خیال رکھنا، گھر کی صاف صفائی، کپڑے دھونا، کھانا پکانا اور کئی چھوٹے بڑے کام شامل ہیں جس میں مرد کسی صورت بھی تعاون نہیں کرتے لہذا عورتیں مجبوراً ایسی ملازمت کرتی ہیں جو غیر مستقل ہو یا جس میں کام کے اوقات کار کم ہوں۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت سمیت کئی ممالک میں لڑکی کو کم عمری میں ہی شادی کرنی ہوتی ہے ورنہ اس کا کوئی معاشی معیار یا تحفظ نہیں ہوتا۔ ایک عورت پوری زندگی ایک بچے کی حیثیت سے باپ پر، شادی کے بعد اپنے شوہر پر اور بڑھاپے میں اپنے بیٹے پر انحصار کرتی ہے اور ایک غیر شادی شدہ لڑکی خاندان کے لیے بوجھ تصور کی جاتی ہے۔[27]

کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اگر تم پوچھو، کیا ایک عورت کو مرد کے برابر اجرت ملنی چاہیے؟ تو اس کے لیے ایک جواب ہوگا۔ ہاں اگر وہ اتنی ہی تعداد میں اور معیاری کام کرتی ہے تو انصاف یہ ہے کہ اسے اجرت دی جائے۔ اس کے حق سے انکار انصاف کی نفی ہے''۔[28]

آج ہم جاگیرداری نظام سے نکل کر سرمایہ درانہ نظام کی طرف آگئے ہیں مگر پدرشاہی کا تسلط بدستور عورت کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ترقی پسند عورت اس نظام کو کچھ یوں بیان کرتی ہے: اس نظام میں دو مثبت پہلو سامنے آئے عورتوں کے حقوق کی نشاندہی اور عورت کے ہاتھ میں آمدنی مگر مسئلہ بہ دستور برقرار رہا، اجرت تو ملی مگر مرد سے کم، گھر سے نکل کر جس رویے کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی انتہائی تکلیف دہ۔ اس کے علاوہ زیادہ آمدنی حاصل کرنے کے مواقع بھی صرف مرد کے پاس رہے اور عورت کو کم تعلیم یافتہ اور ہنر کی کمی کی وجہ سے کم آمدنی اور زیادہ محنت والے کام ملے جس نے اس کی معاشی حیثیت پر کوئی واضع فرق نہیں ڈالا۔[29]

عورت گھر میں مردوں کے جس حاکمانہ رویے کو سہتی ہے اس کی وجہ سے جب گھر سے نکل کر سماج کا سامنا کرتی ہے تو خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے کیونکہ اسے بہت سے غیر اخلاقی اور غیر مہذب رویوں کا سامنہ کرنا پڑتا ہے۔

عورت کے اس ڈر اور بے بسی کو پروین شاکر نے اشعار میں یوں ڈھالا ہے:[30]

یا اللہ میں کہاں جاؤں
سر پہ پہاڑ سی رات
چاروں طرف بھیڑیے
اور عورت بو سونگھتے ہوئے شکاری کتے
ہمیں گھاس نہ ڈالنے کا نتیجہ کہتی آنکھیں
ہمیں موقع دو کہنے والے اشارے
اور چھیڑے اُڑانے والے قہقہے
اور مار دینے والی ہنسی
ٹھٹے کرتی ہوا اور فقرے کستی بارش
ہر طرف سے سنگباری۔

ایک اہم مسئلہ جو سرمایہ دارنہ نظام میں سر چڑھ کر بولنے لگا وہ تھا منڈی کو فروغ دینے کے لیے عورت کی نمائش، جس کی مثال ہمیں مختلف مصنوعات کے اشتہارات میں مل جاتی ہے۔ ایک عورت جسے اپنی ملکیت تصور کر کے گھر میں ایک بھیڑ بکری سمجھ کر بند کر دیا گیا تھا جب میڈیا کی مہربانی سے مختلف مصنوعات کو فروغ دیتی، ہنستی مسکراتی، خوبصورت لباس زیب تن کرتی نظر آئی تو اس کے کردار کو انتہائی مشکوک سمجھا گیا اور گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی ہر عورت پر باغی یا عیاش ہونے کا سرنامہ لگا دیا۔ اس سوچ نے عورت کے لیے زہر کا کام کیا اور اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی عورت عیاشی کے لیے نکلتی ہے تو کیا مرد بھی اسی لیے نکلتا ہے؟ اور اگر نکلتا ہے تو اس پر اتنے پہرے کیوں نہیں لگائے جاتے۔ ماریہ مائز کے مطابق ''عورت کے کام کو غیر معتبر حیثیت حاصل ہے''۔31

عورت کے گھریلو کام جیسے بچوں کی پیدائش، پرورش، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، برتن دھونا، ان کی کوئی پیداواری حیثیت نہیں۔ یعنی اس کام کی کوئی اجرت نہیں۔

وراثت

کسی بھی معاشرے میں طبقاتی نظام بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ ایک خیال ہے کہ زمین پر درحقیقت سرکار کی ملکیت ہونی چاہیے ہر قسم کی نجی ملکیت کا خاتمہ ہو لیکن اگر اس کی تقسیم ہو تو مرد اور عورت میں برابر اور منصفانہ ہو۔ پاکستان میں عورت کو دوسرے درجے کی حیثیت حاصل ہے۔ صدیوں سے مرد عورت پر حکومت کرتا آرہا ہے یہ ایک سماجی یا معاشرتی سوچ ہے اور چونکہ عورت اس تسلط کی عادی ہوتی ہے اپنے حقوق کو نہ پہچانتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے آواز بلند کرتی ہے۔ خصوصاً وراثت کے معاملے میں عورت کو بہت سخت مخالفت کا سامنا ہے۔ ایک بیٹی ہونے کی حیثیت سے اسے زمین اور جائیداد کے حوالے سے بہت سی مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔ جہیز کو عورت کا حق سمجھتے ہوئے اسے وراثت کے حق سے محروم کردیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے جہیز کی صورت اپنی وراثت کا حق مل گیا ہے۔ یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ جہیز کا فائدہ لڑکی سے زیادہ اس کا شوہر اور شوہر کے گھر والوں کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا عمل ہے جس نے عورت کو برائے نام فائدہ دیا مگر دراصل ایک مرد نے دوسرے مرد کی مدد کی۔ صرف پاکستان میں دو ہزار لڑکیاں ہر سال جہیز کے نام پر جلادی جاتی ہیں۔ پاکستان جہیز اور تحائف رسٹرکشن (روکنے کے لیے) بل 2008 کے تحت جہیز 30,000 پاکستانی روپے اور دلہن کے تحائف 50,000 روپے کی مالیت پر موقوف ہیں جنہیں بڑھا کر آسمان تک پہنچا دیا گیا ہے۔32

ترقی پزیر ممالک میں زمین یا جائیداد کا حق عورت کو بہت مشکل سے ہی ملتا ہے، اگر عورت کو یہ حق مل جائے تو وہ خود کو ہر لحاظ سے مضبوط اور خود مختار تصور کرے گی۔ زمین خوراک حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور اس سے پیسہ بھی کمایا جاسکتا ہے جس سے عورت کو معاشی تحفظ بھی ملے گا۔

سیاسی استحصال

سیاسی استحصال وہ بنیادی جز ہے جو عورت کو زندگی بھر آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ عورت پر ایک بہت بڑی پابندی فیصلہ سازی نہ کرنے کی بھی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اس کے لیے مرد فیصلہ کرتے ہیں خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک میں بہت کم عورتیں اپنے فیصلے خود کرتی ہیں۔ مرد کے ذہن میں عورت کا تصور ایک کم فہم اور کمزور ہستی کا ہے جس کی ہر بات کا تنقیدی جائزہ لینا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے اور اسے پدری سماج کے دائرے میں اس طرح قید کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشی اور سیاسی حقوق کی طرف قدم بڑھا ہی نہیں سکتی۔

عورت کو وہ مواقع ہی نہیں ملتے جو مرد کے مقابلے اسے معاشی طور پر مستحکم کرسکیں۔ مردوں کا ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے چونکہ وہ نازک ہے سو اسے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں اور وہ باہر سے زیادہ گھر کے کام زیادہ خوش اسلوبی سے کرسکتی ہے۔ یہ وہ کام ہیں جو مستقل بنیادوں پر ہوتے ہیں اور معاشرہ انہیں کوئی پیداواری حیثیت نہیں دیتا۔ جب عورت گھر سے باہر ہی نہیں نکلے گی تو اپنے لیے یا دوسروں کے لیے فیصلے کیسے کرے گی۔ پاکستان میں اول تو عورت گھر سے باہر موجود ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کی کوئی آواز نہیں۔

اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو ہر قسم کی جدوجہد میں عورت نے اپنا کردار بہ خوبی نبھایا مگر ہر بار اس کا ثمر مرد کے حصے میں آیا، ''تاریخی لحاظ سے جمہوریت نے عورت سے زیادہ ہمیشہ ایک مرد کی خدمت کی ہے''۔33

ایک لڑکی جب تعلیم حاصل نہیں کرتی، اسے یہ حق حاصل ہی نہیں، تو وہ یہ فیصلہ کیسے کرسکتی ہے کہ اسے زندگی میں کیا چاہیے۔ اگر اس کی دنیا میں سب کچھ صرف چادر اور چار دیواری ہے، وہ باہر کی دنیا سے نا آشنا ہے تو وہ دنیا کو اپنے خیال اور تصور کی آنکھ سے دیکھے گی اور چونکہ وہ گھر میں مرد کے ایک حاکمانہ اور سرد رویے کو سہتی رہی ہے تو کبھی باہر کے ماحول کو دوستانہ محسوس نہیں کرے گی اس لیے اسے فیصلہ لینے میں بہت دشواری کا سامنا ہوگا۔ پاکستان میں تعلیم کی شرح بہت کم ہے۔ عورت پر نسل، مذہب، روایات، جذبات، پیسہ اور ایسی بہت سی چیزوں کا دباؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی فیصلہ کرنے کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ مگر ایک تعلیم یافتہ لڑکی اپنے ذہن کا استعمال کر کے بہتر فیصلہ کرسکتی ہے۔

اگر ایک لڑکی تعلیم کی منزل تک پہنچ گئی تو وہ بہت خوش قسمت ہے کیونکہ وہ اس مقام تک رسائی حاصل کرچکی ہے جہاں سے وہ اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ تعلیم تو حاصل کرلی مگر کیا وہ اس کی دلچسپی کے مطابق ہے؟ کیا گھر اور باہر کے معاملات

میں اس کی رائے کی کوئی اہمیت ہے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرسکتی ہے؟ اگر ہاں تو وہ شخصی طور پر آزاد ہے اور اسے فیصلے کا حق حاصل ہے لیکن اگر نہیں تو پھر وہ سیاسی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ جب اسے اپنی زندگی پر ہی اختیار نہیں تو وہ معاشرے میں اپنا کردار کیسے نبھائے گی۔ شاید یہی وجہ ہے حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والی عورتوں کی تنظیمیں یہ نعرہ لگاتی ہیں، ''ذاتیات سیاست ہے (personal is political)''۔

سیاسی عمل میں عورت کا کردار انتہائی کمزور ہوتا ہے۔ اگر عورت تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بھی مستحکم ہو تو وہ فیصلہ سازی با اعتماد طریقے سے کرسکے گی۔ اگر ملازمت پیشہ عورتوں اور گھریلو عورتوں کا موازنہ کیا جائے تو دونوں کی سوچ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں عورت کو سماج کا ایک کمزور حصہ سمجھا جاتا ہے۔ سماجی دباؤ اور بے حسی نے عورت کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ پیدائش سے ہی اس کی شادی کے لیے ماں باپ کا پریشان ہونا اور ایک خاندان میں رہ کر ہی اس کو محفوظ تصور کرنا، عورت کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ سیاسی طاقت حاصل کرنا عورت کے لیے بہت اہم ہے یعنی عورت کی الگ پہچان ہو، وہ خودمختار ہو اور اپنے خاندان اور مذہب سے الگ اس کی اپنی شخصیت اجاگر ہو۔[34] آمد و رفت کی پابندیاں عورتوں کی سیاسی اور معاشی صلاحیت کو روکتی ہیں۔ اگر ان پابندیوں کو نرم کیا گیا تو یقیناً عورتوں کی مزدور طبقہ میں شمولیت بڑھے گی اور وہ سیاسی عمل میں حصہ لے سکیں گیں۔ مگر اس میں سب سے بڑی رکاوٹ مردوں کا رویہ ہے۔ پوری دنیا میں اس وقت گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ بہت عام ہے مگر اس پر بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ایک تنظیم الائنس اگینسٹ سیکشوئل ہراسمنٹ Alliance Against (Sexual Harrasment-AASHA) کے مطابق پاکستان میں عورت کو اس تکلیف کا سامنا تقریباً ہر جگہ پر ہے، عوامی ذریعہ سفر کے دوران 92 فیصد، کام کے دوران نرس کو 58 فیصد، گھریلو کام کرنے والی عورتوں کو 91 فیصد، اینٹوں کے بھٹے، کھیت اور مختلف شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کو 93 فیصد مردوں کے اس ظالمانہ اور مکروہ رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کا یہ رویہ عورت کے باہر نکلنے اور کسی بھی قسم کے عملی کام میں آگے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔[35] مردوں کے اس رویے کو قابو کرنا بہت ضروری ہے ورنہ عورت کے اندر اعتماد کی کمی رہے گی اور وہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ 1910 سے پہلے عورت کو حق رائے دہی استعمال کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا مگر ایلس پال اور لوسی برنز نے عورت کے حقوق کے لیے امریکہ میں ایک مہم چلائی جس کے نتیجے میں 1920 سے عورت کو ووٹ ڈالنے کی آزادی حاصل ہوئی۔[36] یہاں سوال یہ ہے کہ کیا عورت اس آزادی کا فائدہ اٹھا سکی یا وہ ابھی تک اٹھارویں صدی کی اسی سماجی قید میں پھڑ پھڑا رہی ہے؟

جدوجہد

''چیزوں کو بدلنے سے وابستگی کا آغاز خود کو بدل کر ہوتا ہے''۔[37] مردوں کے بنائے فرسودہ نظام زندگی اور سماج کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم خود کو تبدیل کریں اور اتنا مضبوط کریں کے حق کے لیے آواز اٹھا سکیں اور اپنی سوچ دوسروں تک با آسانی پہنچا سکیں۔ ہمیں اپنے اندر کے خوف سے لڑنا ہوگا جو حفاظت، تحفظ، بچوں کی فلاح اور خاندان سے جڑا ہے۔[38] عورت کو اپنی طاقت کا اندازہ لگانا ہوگا اور اتفاق و اتحاد سے ایک مٹھی کی طرح جدوجہد کرنی ہوگی کیونکہ الگ رہ کر اس جنگ کو جیتنا مشکل ہوگا۔ ہم کہیں بھی جائیں ہمیں ہماری ہم خیال عورتیں مل جاتی ہیں اور ہمارے اتحاد کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس جدوجہد کو ہم زندگی کے ہر راستے میں کریں چاہے وہ اپنا گھر، خاندان یا محلّہ ہو۔ مقامی سطح پر عورت کو باقاعدہ اپنی اہمیت اور خود آگاہی کی راہیں دکھانا ایک کلیدی کام ہے۔ عورت جب اپنی بقاء کی جنگ میں شامل ہوگی تو ہی اپنے گاؤں، شہر اور ملک میں عورت کے لیے ایک بااختیار اور خودمختار زندگی حاصل کر پائے گی۔ جو عورتیں دوسری عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں یا ان کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ بیٹا بیٹی برابر بھی ہو سکتے ہیں انہیں بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہ عورت دراصل پدر شاہی سوچ کا شکار ہے اور وہ عورت کے اندر کی نگاہ کھو چکی ہے۔[39]

عورت کے حقوق کی حفاظت نہیں کی جاتی اور حکومتی سطح پر کوئی کام ایسا نہیں جو اسے اتنا مضبوط کرے کہ وہ بے خوف ہو کر سماج سے مقابلہ کرسکے معاشی استحکام حاصل کرسکے یا فیصلہ سازی کرسکے۔ اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلائیں چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں۔ لڑکیوں کی تعلیم اس وقت پاکستان کا ایک اہم مسئلہ ہے دیہات میں اول تو اسکول ہی نہیں اور اگر ہیں تو صرف پہلے درجے تک ہیں جس کے لیے آواز اٹھانی ہوگی۔ حکومت کو صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ حقیقتاً ہر قسم کی فرسودہ روایات اور رسومات پر باقاعدہ پابندی لگانی ہوگی اور ایسے قوانین بنانے ہونگے جو عورت کو مکمل تحفظ فراہم کریں۔ عورت گھر میں جو کام کرتی ہے اسے حکومتی طور پر مزدوری کا درجہ ملنا چاہئے تاکہ عورت خود آگاہی کی منزل طے کرکے اپنا حق رائے دہی استعمال کرے اور ملک کے مستقبل کے فیصلوں میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔

ہم ایسی قوم بن کر سامنے آئیں جو عورت اور مرد کو مکمل سیاسی اور سماجی مساوات دے ہمیں ایک صحت مند معاشرے کی ضرورت ہے جو سچ اور انصاف کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس انداز سے جدوجہد کریں کہ مرد بھی ہمارے ساتھ شامل ہوں اور یہ بات سمجھ جائیں کہ عورت کی آزادی اور ترقی کے بغیر ان کی بھی ترقی اور ایک صحت مند معاشرہ ممکن نہیں۔

ایک سوال اور ایک عہد

کیا میں اس مٹی سے بنی ہوں جس سے میرا بھائی بنا ہے
اگر ہے ایسا تو پھر کیوں؟ اس کے کپڑے ہیں اُجلے اُجلے
میری ایسی حالت کیوں ہے
میں کیوں کھاؤں سوکھی روٹی اور کیوں پہنو میلے کپڑے
وہ دیکھو اسکول کی گاڑی
بیٹھ گیا ہے بھائی اس میں
اس میں تو ہیں اور بھی لڑکے
جن کے ہاتھوں میں ہیں بستے
کیا کبھی میں ان میں شامل ہونگی
اور پڑھ پاؤ گی یہ رنگین کتابیں
میں نے دیکھی نہیں ہیں اب تک
کیسی ہوتی ہیں ان میں تصویریں
میں نے اپنا بستر دے کر
بھائی کو ہے سردی سے بچایا
رات کو اب میں سو نہیں پاتی
سپنے سہانے جی نہیں پاتی
کیا میں اس مٹی سے بنی ہوں جس سے میرا بھائی بنا ہے
اگر ہے ایسا تو پھر کیوں؟ اُسکی ہر خواہش ہوتی ہے پوری
پچھلے برس عید پر ابا، لائے تھے میری اک گڑیا
دیتی نہیں ہیں اب وہ مجھ کو اماں
کہتی ہیں اب تم گھر سنبھالو
تم کو پرائے دیس ہے جانا
میرا دل تو ڈر سا گیا ہے
اس میں جدائی کا غم جو چھپا ہے
بابل کا گھر چھوڑ رہی ہوں
نئے خوابوں کو تول رہی ہوں
سوچ رہی ہوں اماں ابا نے
پہلے کیوں نہ دیا یہ سب کچھ
زیور، کپڑے، جوتے، سج دھج
کیا یہ سب میرا ہے سچ مچ
لگتا ہے یہ جھونکا ہوا کا
یا یہ بھی ہے اک دھوکا
کیا میں اُس مٹی سے بنی ہوں جس سے میرا بھائی بنا ہے
اگر ہے ایسا تو پھر کیوں؟ وہ نہیں جاتا چھوڑ بابل کی گلیاں
نئے رشتوں کی ہیں کچھ نئی اُڑانیں
یہاں کے ہیں کچھ نئے فسانے
ہر رشتہ مجھ کو پرکھ رہا ہے
اپنی ذات کے آئینوں میں
کیسے لگوں گی میں انکو اچھی
جب دیکھیں گے مجھے دشمن کی نظر سے
ساس نے مجھ سے یہ کیوں کہا ہے
خود کو نہ سمجھنا مختار بہت ہی
بیٹا ہے میری زندگی کا سرمایہ
تو ہے میرے جیسی اک داسی
ماں نے پھر کیا جھوٹ کہا تھا؟
بیٹی اب تو راج کرے گی!
کیا میں اس مٹی سے بنی ہوں جس سے میرا بھائی بنا ہے
کیا میں اتنی ہی بری ہوں یا میری مٹی ہی جدا ہے
وقت رشتے حالات ہیں بدلے
کچھ میرے بھی انداز ہیں بدلے
نئی کہانی کا ہے اب اک نیا آغاز
کہ گھر میں آنے والا ہے اک نیا مہمان
لیکن یہ کیا؟ یہاں تو اک بڑی الجھن ہے
سب کو تو چاہیے کہ ہو اک بیٹا
بیٹے کی ماں کے ہوتے ہیں سو سکھ
تو کیا؟ بیٹی تو خود ہی ہوتی ہے اک سکھ
اللہ نے دیا ہے مجھے اک تحفہ
اک بیٹی جو بنے گی میرا سہارا
اپنی بیٹی کو پڑھاؤں گی
اسے ہر ہنر دنیا کا سکھلاؤں گی
گرم موسم کو سرد رویوں کو وہ سمجھ کر
انصاف اور سچ کے پہلو سے لڑ سکے گی
وہ اپنے قلم سے لکھے گی نصیب اپنا
کوئی مرد نہ لکھے گا تقدیر اس کی
کبھی نہ پہناؤں گی سماج کی زنجیریں
جو قرب بن کر اس کی زندگی کو سہائیں
مگر اک ہلچل سی ہے اس نگر میں
بہت سے خدشے ہیں میرے دل میں
جو کیے ہیں وعدے خود سے میں نے
وہ کیا میں ابد تک نباہ سکوں گی۔

رابعہ وسیم

حوالہ جات

1. Bhasin, Kamla. "What is patriarchy?" Kali for Women, I993, p. 3.
2. Lady, Susan. "Feature writings in women magazines: A limited ideological challenge". Irish Communication Review, Vol. 5, May 18th, 1995, p. 27.
3. Bhasin, Kamla. "What is patriarchy?" Kali for Women, I993, p. 15.
4. Hasegava, Koyoko. "Sendai Japan women are key in tackling disasters" France 24. AFP, 2015? Accessed from http://m.france24.com/en/20150316-women-are-key-tackling-disaster-un-officials/
5. Mohammad, Ali, Syed. "The shrinking space for Hijabi women in the west." The Express Tribune, March 17, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/854216/the-shrinking-space-for-hijabi-women-in-the-west
6. "Every third woman in the world victim of physical, sexual violence: WHO." F. India, June 20, 2013. Accessed from "every-third-woman-in-the-world-victim-of-physical-sexual-violence", June 20th, 2013. Accessed from www.firstpost.com.
7. Thomson Reuter's Foundation. "Thomson Reuter's foundation poll expert survey." June 15, 2011. Accessed from http://www.trust.org/spotlight/the-worlds-most-dangerous-countries-for-women-2011/
8. Nasreen, Taslima. "No country for women." April 30, 2012. Freethoughts.blog.com 2014. Accessed from http://freethoughtblogs.com/taslima/2012/04/30/its-a-girl-kill-her/
9. Cripps, A. "Educate a man and you educate an individual. Educate a woman and you educate a family." Changing the World. Accessed from http://changingthepresent.org/women/quotes
10. Girls Not Brides. "National marriage registration to enforce child marriage laws in Pakistan." Girls No Brides. Accessed from http://www.girlsnotbrides.org/national-marriage-registration-to-enforce-child-marriage-laws-in-pakistan/
11. UNICEF. "Every day, every minute, a woman dies giving birth: UNICEF calls for global commitment to reduce maternal mortality." Press release, March 8, 2002. UNICEF. Accessed from http://www.unicef.org/newsline/02pr07iwd.htm
12. Nazir, Ghazala et al. "Anemia: the neglected female health problem in developing countries." J Ayub Med Coll Abbottabad 2011:23(2), p. 8, 10. Accessed from http://ayubmed.edu.pk/JAMC/23-2/Ghazala.pdf
13. "Pakistan has highest incidence of breast cancer in Asia." The DAWN, October 25, 2014. Accessed from http://www.dawn.com/news/1140264
14. Pankhurst, Emmeline. "Women right's quotes. Better world quotes." Accessed from www.betterworld.net/quoteswomen.htm
15. "Woman stoned to death outside Lahore court." May 27, 2014. Accessed from www.dawn.com/news/1108900
16. Harris, Robert and Singh, Viajai. "Kristof Nicholoas: from victim to heroine." New York Times, November 27, 2008. Accessed from http://www.nytimes.com/video/opinion/1194834021302/from-victim-to-heroine.html?playlistId=1194811622305
17. Salam, Ghausia Rasheed, "Recording rape." The News on Sunday, Dialogue 27, March 29, 2015.
18. Khan, Azam. "Mukhtara Mai appeal: delayed and denied." The Express Tribune, April 22, 2011, Accessed from http://tribune.com.pk/story/153641/mukhtaran-mai-case-5-of-6-accused-acquitted/
19. Pakistani Youth. "Vani: child marriages in Pakistan." Accessed from www.youthexperia.blogspot.com/2012/10/vani-child-marriage.html
20. Foundation of Research and Community Empowerment. "FRCE report on Karo Kari issue in Sindh." FRCE, November 26, 2012. Accessed from www.slideshare.net/frcengo5/frce-research-report-on-karo-kari-issue-in-sindh
21. Shah, Waseem, Ahmed "Existing laws support suspects in swara cases." DAWN, March 31, p. 7, 2015.
22. Ramirez, Ximena. "Getting burned in Pakistan." Care 2, July 8, 2009. Accessed from www.care2.com
23. Imran, Myra. "4,585 cases of violence against women reported in 2012." The News, October 23, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/Todays-News-6-139039-4585- cases-of-violence-against-women-reported-in-2012
24. "Circle of rights, economic, social and cultural rights activism: a training resource." Human Rights Resource Centre, University of Minnesota. Accessed from www1.umn.edu/humanrts/edumat/IHRIP/circle/modules/module4.htm
25. CPI (ML), Central Committee. "Our approach to the women question." CPI (M-L), January, 2002, p. 11.
26. Gering, Jeany. "Awakening to patriarchy: a conversation with Maria Mies (Part one)." February 5, 2014. Accessed from http://nakedpunch.com/articles/212
27. Shah, Anup. "Women rights." March 14, 2010. Accessed from http://www.globalissues.org/article/166/womens-rights
28. Altgeld, John, P. "Women right's quotes. Better world quotes." Accessed from www.betterworld.net/quoteswomen.htm
29. CPI (ML), Central Committee. "Our approach to the women question."
30. Shakir, Parveen. "Parween Qadir Agha," Inkar. December, 2002, p. 189.
31. Gering, Jeany. "Awakening to patriarchy: A conversation with Maria Mies (Part one)."
32. "Down with dowry." DAWN, May 28, 2008. Accessed from http://www.dawn.com/news/304861/down-with-the-dowry
33. Duflo, Esther. "Women empowerment and economic development." Journal of Economic Literature, 50(4) 1051-1079, p. 1053. Accessed from http://economics.mit.edu/files/7417
34. Bari, Farzana. "Women's political participation: issues and challenges (Draft)." EGM/WPD-EE/2005/EP.12, November 3, United Nations, 2005. Accessed from http://www.un.org/womenwatch/daw/egm/enabling-environment2005/docs/EGM-WPD-EE-2005-EP.12%20%20draft%20F.pdf
35. "Alliance Against Sexual Harrasment (AASHA). "What is gender discrimination and sexual harassment?" AASHA. Accessed from http://www.aasha.org.pk/what_is_sexual_harass.php
36. Garnier, Katja von (Director). "Iron Jawed Angels" (a T.V movie) 2004, IMDb. Accessed from http://www.imdb.com/title/tt0338139/.
37. Antrobus, Peggy. "The global women's movement: origins, issues and strategies." Books for Change (Bfc), David Philip, Publishers, chapter 9, p. 166.
38. Ibid.
39. Ibid.

زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی اجرت

تحریر: ثنا شریف

پیش کردہ مضمون میں بھی یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ زراعت کے شعبے میں مزدور عورت کا کیا کردار ہے۔ جس کے لیے صوبہ سندھ کے بالائی اور زیریں علاقوں کے کچھ گاؤں میں زرعی مزدور عورتوں کو فصلوں کی کٹائی کی مد میں دی جانے والی اجرتوں کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بہتر روزگار کی فراہمی اور رسائی کسی بھی ملک کی اجتماعی بہبود کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی روزگار کی بدولت افراد اپنی اور خود سے وابستہ زندگیوں کے معیار کو بہتر بناتے ہیں۔ اچھے روزگار (decent work) کی فراہمی کو معاشی ترقی اور انسانی وسائل (مرد اور عورت) کی ترقی سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ اگر زرعی روزگار کے حوالے سے دیکھا جائے تو عالمی سطح پر دنیا بھر میں ایک بلین سے زائد زرعی مزدور موجود ہیں یعنی دنیا کی کل آبادی کا ساتواں حصہ۔ دنیا میں عالمی سطح پر زراعت کو دوسرا بڑا ذریعہ معاش سمجھا جاتا ہے۔ جس کے ذریعے دنیا بھر کے 34 فیصد مزدور اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس کے باوجود بھی بہت سے ممالک میں زراعت کے شعبے سے وابستہ 60 فیصد مزدور غربت کی زندگی گزار رہے ہیں اور 20 فیصد آبادی کو بنیادی سماجی تحفظ تک رسائی تک حاصل نہیں ہے۔[1] زراعت کا شعبہ مجموعی قومی پیداوار، بنیادی خوراک اور زرعی مزدوروں کے روزگار کے حوالے سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس شعبے سے وابستہ کسان اور کئی زرعی مزدور ایک سال میں کم سے کم چھ ماہ کے وقفے سے روزگار کے حصول میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ اکثر اوقات مرد زرعی مزدور نامساعد موسمی بحرانوں اور فصلوں کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے قریبی شہروں میں تعمیراتی مزدوری کے علاوہ چھوٹی موٹی مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

انسانی ارتقائی عمل میں عورتیں ہر طرح کے پیداواری عمل میں خصوصاً زراعت میں اپنا حصہ ڈالتی چلی آرہی ہیں۔ ماہر اقتصادیات عورتوں کی معاشی سرگرمیوں کی وکالت اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ان مزدور عورتوں کی شمولیت کے بغیر انسانی وسائل کی ترقی ممکن نہیں ہے لیکن اس وقت سے لے کر آج تک ان کی انفرادی قوت کو مختلف ثقافتی اور سماجی رکاوٹوں، قانونی حقوق سے محرومی اور امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔[2] زرعی مزدور عورتوں کو صنفی امتیاز کی بنیاد پر مردوں کے مقابلے مناسب روزگار تک رسائی اور اجرت کے غیر منصفانہ رجحانات جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت بحیثیت مزدور گھر سے باہر اور گھر کے اندر دہری ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔ حقیقتاً زراعت میں عورتوں کا کردار ہمیشہ سے اہم رہا ہے لیکن عورتوں کی یہ شمولیت یا تو ثانوی مانی جاتی ہے یا پھر سرے سے ان کی اہمیت کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ زراعت کے شعبے میں پیداوار، روزگار اور آمدنی کے لحاظ سے عورتوں کی شراکت داری کو عارضی محنت اور معاون / مددگار کے ناموں سے شناخت دے کر اجرت کے حق سے محروم کردیا جاتا ہے۔ عورتوں کی اس محنت کو اس کے فرائض میں شامل سمجھ کر اس کے معاشی پہلو کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔[3]

ایشیائی ترقیاتی بینک کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق ایشیاء اور بحرالکاہل کی چار معیشتیں جن میں ہانگ کانگ، چین، قازقستان اور منگولیا شامل ہیں، مردوں اور عورتوں کو روزگار کے یکساں مواقع فراہم کرتی ہیں۔ جب کہ اسی خطے کے 17 ممالک کی معیشتوں میں زرعی شعبے کے علاوہ 60 فیصد اجرت پر مردوں کا قبضہ ہے۔ پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور بھارت میں ان اعداد و شمار کو بیان کرنا کافی حیران کن ہے کیونکہ ان ممالک میں مردوں کے مقابلے مزدور عورتوں کی تعداد دگنی ہے۔ صرف غیر زرعی شعبوں میں کام کرنے والی 12 فیصد عورتیں اپنے روزگار کا تحفظ کر پاتی ہیں۔ جبکہ بھارت اور افغانستان میں یہ شرح 18 فیصد اور بنگلہ دیش میں 20 فیصد ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اجرتی روزگار مردوں کے حق میں جاتا ہے۔[4] اقوام متحدہ کا بین الاقوامی ادارے برائے محنت کش آئی ایل او (International Labour Organisation-ILO) کی اجرت کے حوالے سے جاری کردہ رپورٹ کے مطابق عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں ہم منصب ملازمتوں کے محدود مواقع اور نامناسب اجرت ادا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مزدور عورتیں مردوں کے مقابلے 38.5 فیصد کم کما پاتی ہیں۔[5]

مزدور عورتوں کی اجرت کے حوالے سے صنفی امتیاز بڑے پیمانے پر دستاویزات کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ بہت سے ممالک میں عورتوں کے ساتھ روزگار کے حوالے سے مساوی سلوک کو لازمی اور اجرت سے متعلق قوانین تشکیل دیے گئے ہیں۔ ان قوانین کے تحت کام کی سطح پر مرد اور عورتوں میں کوئی تفریق نہیں ہوگی لیکن ان تمام قوانین کے بعد بھی یہ صنفی تفریق ہمیں کثرت سے دکھائی دیتی ہے۔ صنفی امتیاز کے حوالے سے عام تجزیہ یہ کہتا ہے کہ وضاحتی طور پر بیان کردہ کام کی خصوصیات اور مقرر کردہ آمدنی کے علاوہ تمام غیر وضاحتی عوامل جو عورتوں کے منفی طرف داری میں جائیں وہ صنفی تفریق کی بنیاد ہوتے ہیں۔[6] دیگر ممالک کے تناظر میں دیکھا جائے تو اجرت میں تفریق بہت معمولی فرق کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ کینیا اور لاطینی امریکہ کے کچھ حصوں میں عورتوں کی اجرت مردوں کی اجرت کے قریب تر ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ایشیا اور افغانستان جیسے ممالک میں یہ فرق 50 فیصد کے حساب سے واضح ہے۔[7] ایشیائی ممالک کی زیادہ تر آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے اور زراعت پر انحصار کرتی ہے۔ ان ممالک کی مجموعی ملکی پیداوار کا دو تہائی حصہ زراعت کے شعبے سے حاصل ہوتا ہے۔ ملک کی زرعی معیشت سے وابستہ مزدوروں کی آمدن کا 66 فیصد حصہ عورتوں کی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔[8]

پاکستان دنیا میں افرادی قوت کے اعتبار سے نواں بڑا ملک سمجھا جاتا ہے لیکن دیگر خطوں خاص کر بحرالکاہل اور ایشیاء کے مقابلے یہاں اجرت کی فراہمی بڑے پیمانے پر عدم مساوات کا شکار نظر آتی ہے۔ عالمی اقتصادی فورم کی 2014 میں شائع کی جانے والی رپورٹ ''گلوبل جینڈر گیپ (Global Gender Gap Report)'' کے مطابق صنفی امتیاز میں پاکستان کو یمن کے بعد دوسرا بدترین ملک قرار دیا گیا ہے۔[9] پاکستان میں دیہی عورتوں کی کل آبادی کا تقریباً نصف حصہ زرعی افرادی قوت پر مشتمل ہے۔ تاہم اس بہت بڑی افرادی قوت کی اجرت بلا معاوضہ ہی تصور کی جاتی ہے۔ بہتر روزگار کے حوالے سے حکومت پاکستان کی جاری کردہ ایک رپورٹ پاکستان ایمپلائمنٹ ٹرینڈز 2011 (Pakistan Employment Trends 2011) کے مطابق زرعی شعبے میں مرد مزدور 34.9 فیصد جبکہ عورتوں کا مردوں کے مقابلے 74.2 فیصد حصہ ہے۔ ایک طرف تو اس رپورٹ کا کہنا ہے کہ اس دہائی کے آغاز سے ہی عورتوں کی افرادی قوت میں شمولیت کی شرح 1999 سے لے کر 2007 تک مجموعی طور پر 5.0 فیصد جبکہ 2006 سے 2011 تک 3.1 فیصد مسلسل اضافے کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔[10] دوسری طرف اکنامک سروے آف پاکستان کی شائع کردہ رپورٹ پچھلے دس سالوں میں افرادی قوت کی شرح میں مجموعی طور پر 28.6-32.3 فیصد کے درمیان کمی کے رجحان کو ظاہر کرتی ہے جس میں خاص کر عورتوں کی افرادی قوت میں 2003-4 میں 15.9 فیصد جبکہ 2005-06 میں 18.9 فیصد کمی واقع ہوئی۔[11] افسوس ناک امر یہ ہے کہ دونوں بیان کردہ اعداد و شمار حکومت پاکستان کے مستند اداروں سے جاری کیے گئے ہیں۔ ان رپورٹوں میں پیش کردہ اعداد و شمار میں کتنا تضاد پایا جاتا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو حکومت کا کہنا ہے کہ پچھلے دس سالوں میں عورتوں کی افرادی قوت کی شرح میں اضافہ ہی ہوا ہے اور دوسری طرف اکنامک سروے آف پاکستان کے اعداد و شمار مزدور عورت کی شمولیت میں کمی ظاہر کررہی ہے۔

پاکستان اکنامک ڈویژن اس بات کو خود تسلیم کرتا ہے زرعی شعبے میں موجود مزدور عورتوں کے حوالے سے لیے گئے اعداد و شمار اصل حقائق سے مختلف ہوسکتے ہیں کیونکہ تحقیق کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیے جاتے ہیں اس میں شمار کنندہ مرد حضرات کو مختلف تحفظات کی بناء پر درست معلومات فراہم نہیں کی جاتیں۔[12] یہاں جن تحفظات کی بات کی جارہی ہے اس میں پدرانہ سوچ اور اقدار کے ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ہمارے معاشرے کی جڑوں میں پنپ رہے ہیں۔ دیہی علاقوں میں عورت سے مزدوری تو کرائی جاتی ہے پر اعداد و شمار اکٹھا کرنے والوں کو یہ بتانے میں شرم محسوس کی جاتی ہے کہ اس گھر میں بھی ایک مزدور عورت موجود ہے۔ ان مزدور عورتوں کا کام چونکہ بغیر اجرت کے ہوتا ہے اس لیے ان اعداد و شمار میں وہی کام شامل ہوتا ہے جس کی اجرت ملتی ہو لیکن جو عورتیں کھیت میں کام کرتی ہیں یا امور خانہ داری سے وابستہ ہیں قومی اعداد و شمار میں ان کی محنت کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ پھر یہ سوال حکومت سے کیا جانا چاہئے کہ وہ تمام تر حقائق جاننے کے باوجود حکومتی سطح پر زرعی اعداد و شمار کا اندازہ کس بنیاد پر دنیا کو فراہم کرتی ہے؟

زرعی مزدوروں کی اقسام

زرعی مزدور سے مراد وہ مرد اور عورتیں ہیں جو مختلف کھیتوں، فصلوں اور باغات، مال مویشیوں کو پالنے سمیت خوارک کے پیداواری عمل میں بنیادی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ اس پیداواری عمل میں زرعی مزدوروں کی مختلف اقسام ہیں۔ جن میں مستقل اور عارضی زرعی مزدور، موسمی زرعی مزدور، روزگار کی غرض سے ایک علاقے سے دوسرے علاقوں میں ہجرت کرنے والے مزدور اور بے زمین کسان شامل ہیں۔ یہ مزدور چھوٹے کھیتوں سے لے کر بڑی بڑی زمینوں پر اجرتی روزگار سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان زرعی مزدور کے حالات کو یکساں طور پر نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ ان مزدوروں کے روزگار کی شرائط اور حالات کی مختلف اقسام اور شکلیں ہوتی ہیں۔ ان مزدوروں کو اجرت کی مد میں کی جانے والی ادائیگی کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے جس میں انہیں نقد رقم کی ادائیگی کے علاوہ غذائی اجناس، فی کلو، فی عدد اور فی ایکڑ کی صورت بھی اجرت فراہم کی جاتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں بیشتر مزدور عارضی اور موسمی کارکنوں کے طور پر کام کررہے ہیں۔ عام طور سے ان کے کام کی نوعیت روزانہ کی بنیاد پر مقرر کردہ ہدف کے مطابق ہوتی ہے۔ زیادہ تر غیر ہنرمند افراد روزانہ کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ اکثر اوقات روزانہ کی بنیاد پر کام کرنے والے کچھ زرعی مزدوروں کو فصلوں کی کٹائی کے دنوں میں رکھے جانے والے مزدوروں کی نگرانی پر بھی مامور کردیا جاتا ہے۔ جس کی انہیں 1,000-1,500 روپے ماہانہ اجرت دی جاتی ہے۔ جبکہ عارضی مزدوروں کا کام مخصوص وقت اور محدود مدت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مزدوری کی غرض سے ایک علاقے سے دوسرے علاقوں میں ہجرت کرنے والے مزدوروں کی افرادی قوت پورے خاندان پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔ بہت سے ممالک میں موسمی مزدور اور ہجرت کرنے والے مزدوروں کے بچے اپنے والدین کے ساتھ کام کرتے ہیں لیکن ان کا کام شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات ان خاندانوں کو اجرت فی عدد کے حساب سے دے جاتی ہے۔ عموماً ان خاندانوں کو کام کے حصول اور زیادہ سے زیادہ اجرت کے لیے اپنے بچوں کی محنت درکار ہوتی ہے۔[13]

یہ تمام مزدور اپنے روزگار کے حوالے سے مختلف کسانوں، بڑے زمینداروں، زرعی کمپنیوں اور مزدور ٹھیکہ داروں کے ساتھ پیداواری رشتوں میں جڑے ہوتے ہیں۔ بدلتی موسمی فصلوں کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر زرعی مزدور خاص کر مزدور عورتوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ فصلوں کی ساخت کے حساب سے مزدور عورتوں کو روزگار پر رکھا جاتا ہے مثلاً کپاس کی چنائی کے لیے مزدور عورتوں کے گروہ، گنے کی کٹائی میں مردوں، بچوں اور بزرگوں سمیت تمام افراد کی خدمات لی جاتی ہیں۔ عام طور سے سبزیوں اور پھلوں کی چنائی ٹھیکہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ فصلوں کی بوائی سے لے کر کٹائی کے اہم دنوں میں ان مزدور کے کام کے اوقات کار اکثر طویل

ہوتے ہیں۔ سندھ کے بہت سے علاقوں خاص کر تھر پارکر کے زرعی مزدور خاندان کپاس کی چنائی اور گندم کی کٹائی کی غرض سے دوسرے علاقوں میں ہجرت بھی کرتے ہیں اور جب تک فصلوں کی کٹائی جاری رہتی ہے عارضی طور پر ان ہی علاقوں میں قیام کرتے ہیں۔ 1950 کی دہائی تک مزدور عورتیں صرف بیج بونے اور غذائی فصلیں (گندم، چاول) اور کپاس کی چنائی تک محدود تھیں لیکن اس وقت سندھ کی زیادہ تر عورتیں تمام زرعی کاموں کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔14

تحقیق کا طریقہ کار:

بالائی سندھ سے ضلع گھوٹکی کے چار گاؤں پنہل سیال، عبد الرزاق سبزوئی، عبداللہ میرانی، رئیس اختیار۔ جبکہ زیریں سندھ کے ٹنڈو محمد خان ضلع کے تین گاؤں عمریو بھیل، مولا بخش لاشاری اور وسایو بھیل جبکہ ضلع ماتلی سے ایک گاؤں ہالیجی ملاح سے تفصیلات حاصل کی گئی ہیں۔

ہر گاؤں میں ایک فوکس گروپ منعقد کیا گیا جس میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ 12 کھیت مزدور عوتیں شامل کی گئیں۔ ان علاقوں میں لگائی جانے والی فصلوں اور سبزیوں کی مزدوری اور اوقات کار کے علاوہ ان کی کاشت، کٹائی اور چنائی کے موسموں پر بھی معلومات حاصل کی گئیں۔ فصلوں میں غذائی اور نقد آور فصلیں شامل تھیں۔ غذائی فصلوں میں گندم اور نقد آور فصلوں میں گنا، کپاس اور چاول شامل تھے اور سبزیوں میں پیاز، ٹماٹر، بھنڈی اور گوار شامل تھیں۔

پیش کردہ مضمون میں کھیت مزدور عورتوں سے حاصل کی گئی بنیادی معلومات کے علاوہ انٹرنیٹ سے حاصل کردہ تحقیقی مضامین اور اخباری جرائد پر بھی انحصار کیا گیا ہے۔

سندھ

صوبہ سندھ کا 140,914 مربع کلو میٹر کے رقبے پر محیط ہے جس میں سے آٹھ ملین ایکڑ رقبہ زرعی پیداوار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ باقی 60 فیصد حصہ بنجر ہونے کے باعث نا قابل کاشت ہے۔ سندھ میں کاشت کی جانے والی اہم فصلوں میں گندم، کپاس، گنا اور سبزیوں سمیت اہم پھل (جن میں کیلا، آم، ناشپاتی اور کھجور) شامل ہیں۔ اس صوبے کو زراعت کے حوالے سے بڑی حد تک پسماندہ تصور کیا جاتا ہے۔15

غذائی فصلیں

گندم:

سندھ میں زرعی مزدور عورتوں کو مختلف غذائی فصلوں پر کام کی مد میں مختلف سطح کی اجرت فراہم کی جارہی ہے۔ زیادہ تر مزدور عورتیں گندم کٹائی کو ترجیح دیتی ہیں تاکہ تاکہ مزدوری کے بدلے بطور اجرت ملنے والے غذائی اجناس کو خوراک کے لیے محفوظ کر سکیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ 1960 کی دہائی میں لائے جانے والے سبز انقلاب نے کسانوں کی خود مختاری کو تو چھینا ہی ہے مگر زرعی مشینری کو متعارف کروا کر عورتوں کے روزگار پر بھی ڈاکہ ڈالا ہے۔ گندم کی کٹائی جو سالہا سال سے عورتیں ہاتھ سے کرتی آرہی تھیں اب ان کے اس روزگار کو بھی گندم کاٹنے کی مشین کے ذریعے چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بالائی سندھ اور زیریں سندھ میں گندم کی بوائی کا دورانیہ مختلف ہے۔ زیریں سندھ میں یہ دورانیہ نومبر کے آخر سے شروع ہوتا ہے اور مارچ کے آخر میں یہاں گندم کی کٹائی مکمل کرلی جاتی ہے جبکہ بالائی سندھ میں نومبر کے وسط سے بوائی شروع کی جاتی ہے اور اپریل کے آخر تک کٹائی ختم ہوجاتی ہے۔

اس حوالے سے گھوٹکی کی تحصیل خان پور کے گاؤں پنہل سیال میں گندم کی مزدوری کرنے والی چھ مزدور عورتوں سے فوکس گروپ کی صورت میں معلومات حاصل کی گئیں جن کے مطابق اس علاقے میں دو طریقے سے گندم کی کٹائی کی جارہی ہے۔ ایک جس میں عورتیں اپنے ہاتھ سے فصل کی کٹائی کرتی ہیں جو روایتی طریقہ کہلاتا ہے۔ دوسرا مشین سے کی جانے والی کٹائی کے بعد عورتوں کی مزدوری کا عمل شروع ہوتا ہے۔

مشینی مزدوری (مشین سے کٹائی کے بعد کی مزدوری) کرنے والی ایک عورت مائی ہدایت کا کہنا تھا کہ مشین جب گندم کاٹ لیتی ہے تو اس فصل کو اکھٹا کر کے گانٹھوں میں باندھنا اور پھر تھریشر تک پہنچانے کا ذمہ بھی اسی مزدور عورت کا ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر ایک بجے تک گندم کو باندھنے اور تھریشر تک پہنچانے کا کام کرتی ہیں۔ ڈیڑھ ایکڑ دو مزدور عورتیں دو دن میں پورا کرتی ہیں۔ ایک ایکڑ پر مزدوری کی اجرت ایک من گندم ملتی ہے۔ مائی ہدایت نے مزید بتایا کہ یہ مشین اتنی تیزی سے کام کرتی ہے کہ ایک گھنٹے میں ایک ایکڑ کی کٹائی پوری کروا لیتی ہے اس وجہ سے پورے علاقے میں گندم کی کٹائی کا دورانیہ جو 15 دن کا ہوتا تھا اب اس مشین کی وجہ سے دس دن کا ہی رہ جاتا ہے۔

گندم کی ہاتھ سے کٹائی کرنے والی مائی رانی کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر ان کے گھر کی چار عورتیں (تین بہوئیں اور ایک پوتی) مل کر گندم کی کٹائی کرتی ہیں۔ ایک دن صرف گندم کی کٹائی میں صرف ہوتا ہے دوسرا دن اس کو باندھنے اور اٹھانے کا کام کیا جاتا ہے۔ ہاتھ سے کٹائی کرنے والی زیادہ تر عورتیں صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک کام کرتی ہیں۔ ہاتھ سے کٹائی کی مد میں ملنے والی گندم دو سے ڈھائی من فی ایکڑ دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مزدور عورتیں گندم کی کٹائی کے موسم میں صرف دس ایکڑ پر گندم کی کٹائی کرپاتی ہیں۔ جس سے ان کو 20 من گندم ہی مل پاتا ہے۔ چونکہ ان کے گھر میں بہو اور بیٹے سمیت 13 افراد رہتے ہیں تو یہ گندم 8-7 ماہ میں ہی ختم ہو جاتا ہے پھر ان کے بیٹے مزدوری کر کے گندم 1,200 روپے فی من خریدتے ہیں۔

مشینی مزدوری کرنے والی ایک عمر رسیدہ مزدور عورت مائی نسیمہ کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ تیز کام نہیں کرسکتی۔ ایک جریب یعنی آدھے ایکڑ پر مشین سے کٹائی کے

بعد چار مزدور عورتیں گندم کی گانٹھیں باندھنے کا کام کرتی ہیں۔ چونکہ ان کے کام کرنے کی رفتار کم ہے اس لیے وہ مشینی کٹائی کے بعد مزدوری کرنے پر مجبور ہیں اور ایک ایکڑ دو دن میں پورا کرپاتی ہیں۔ اس لیے پورے کٹائی کے موسم میں صرف پانچ ایکڑ پر ہی مزدوری کرتی ہیں۔ جس سے صرف پانچ من گندم ملتی ہے۔ مائی نسیمہ اپنی 20 سال کی بیٹی کے ساتھ گندم کی مزدوری کرتی ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ جن زمینداروں کے بڑے رقبے پر گندم کاشت ہوتا ہے وہ مشین سے کٹائی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر کم رقبے پر گندم کاشت ہوتا ہے تو ہاتھ سے کٹائی کروائی جاتی ہے۔ اکثر مزدور عورتیں زمینداروں کو فصل کٹنے سے پہلے ہی کہتی ہیں کہ اگر مشین سے کٹائی کرائی جائے گی تو وہ مزدوری نہیں کریں گی کیونکہ اس سے معاوضہ کی مد میں ملنے والا غلہ ناکافی ہوتا ہے۔ گندم کی ہاتھ سے کٹائی کرنے والی مزدور عورت کا کہنا تھا کہ آٹھ افراد مل کر ایک دن میں ایک ایکڑ پر کٹائی کر لیتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ایک عورت پورے کٹائی کے موسم میں دس ایکڑ سے زیادہ پر کٹائی نہیں کرپاتی ہے۔ فصلوں کی مشین کے ذریعے کٹائی کے حوالے سے عورتوں کا کہنا تھا کہ ایک تو اس نے ان کے غذائی اجناس کی کٹوتی کی دوسری طرف روزگار کے مواقع بھی محدود کیے کیوں کہ جس ایک ایکڑ پر آٹھ افراد مل کر روزی کماتے تھے اب وہاں دو افراد کام کررہے ہیں۔ ایک تو روزی ختم دوسرا معاوضہ بھی آدھا کردیا گیا۔

گندم کی کٹائی کے حوالے سے زیریں سندھ کے ضلع ٹنڈو محمد خان کے گاؤں عمریو بھیل میں ہندو برادری کی چند مزدور عورتوں سے بھی فوکس گروپ کے ذریعے معلومات لی گئی۔ ہندو مزدور عورت سونی کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں گندم کاٹنے کی مشین ابھی نہیں آئی ہے یہاں ابھی بھی ہاتھ سے گندم کاٹنے کا رواج ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر مزدوری ہندو برادری کے لوگ کرتے ہیں جبکہ مسلمان زیادہ تر ہاری ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر چار سے پانچ افراد مزدوری کرتے ہیں جو تین دن میں ہاتھ سے ایک ایکڑ کی کٹائی پوری کر لیتے ہیں۔ مزدور عورتیں صبح آٹھ بجے سے دوپہر 12 بجے تک کام کرتی ہیں پھر کھانا کھانے کے بعد ایک سے چار بجے تک واپس کام کرنے جاتی ہیں۔ ایک ایکڑ کی کٹائی کی مد میں ان کو ڈیڑھ من گندم دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک مہینے تک ہاتھ سے گندم کی کٹائی ہوتی ہے۔ پورے کٹائی کے موسم میں 6-4 ایکڑ پر کٹائی کرتی ہیں۔ ہماری حاصل کردہ معلومات کے مطابق بالائی سندھ میں مزدوری کرنے والی بیشتر مزدور عورتوں کو گندم کٹائی کی مد میں ملنے والی اجرت دو من ہے۔ ہم نے اس مزدور عورت سے معلوم کیا کہ وہ اس بات سے باخبر ہیں جس پر مزدور عورتوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے جب یہی سوال وہ زمیندار سے کرتے ہیں تو ان کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی زمین پر پیداوار اچھی ہوتی ہے وہ دو من گندم مزدوری دے سکتا ہے۔ مائی سونی کا کہنا تھا کہ ہم بے زمین کسان ہیں اس لیے مجبور ہے کہ ہمیں روزگار کی مد میں جو بھی اجرت دی جائے لینی پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس زمین پر کسان کی دن رات کی محنت شامل ہو وہ اس بات سے لاعلم ہوسکتا ہے کہ پیداوار اچھی ہوئی ہے یا بری؟ اس حوالے سے ہم نے گھوٹکی کے ایک مقامی کسان سے معلوم کیا کہ آخر زیریں سندھ میں اجرت کی مد میں گندم کم کیوں دی جارہی ہے؟ مقامی کسان کے خیال کے مطابق اگر گندم خراب ہو یا پیداوار اچھی نہ ہو تو عام طور سے کسان مزدور عورتیں ایسی فصلوں کی کٹائی نہیں کرتی کیوں کہ اس کی کٹائی زیادہ وقت لیتی ہے اس لیے اس مد میں تو گندم کی اجرت زیادہ ہونی چاہئے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ چونکہ بالائی سندھ میں مزدوروں کی طلب زیادہ ہے لوگ گندم کٹنے سے پہلے ہی مزدوروں سے کٹائی طے کر لیتے ہیں۔ جبکہ زیریں سندھ میں زیادہ تر ہندو برادری بے زمین ہے اور یومیہ مزدوری سے وابستہ ہے اس لیے وہاں مزدوروں کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب کٹائی کی مد میں گندم کم دی جاسکتی ہے۔

نقد آور فصلیں

چاول:

سندھ میں کاشت کی جانے والی دوسری اہم فصل چاول ہے۔ سندھ کے تقریباً دو ملین ایکڑ رقبے پر چاول کاشت کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ صوبہ سالانہ 3.5 ملین ٹن پیداوار کے ساتھ ملکی چاول کا 35 فیصد حصہ پیدا کرتا ہے۔ سندھ میں چاول کی کاشت سے وابستہ زرعی مزدوروں کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔[16] چاول کی بوائی جون میں کی جاتی ہے۔ بوائی کے چالیس دن بعد پنیری لگنے سے لے کر اکتوبر کے آخری ہفتے تک اس کی کٹائی کا عمل پورا کرلیا جاتا ہے۔

بالائی سندھ کے گاؤں پنہل سیال کی کھیت مزدور عورتوں کے مطابق صوبہ سندھ میں چاول کی کاشت کے لیے روایتی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے جسے عام طور سے علاقائی زبان میں ''ونگار'' کہا جاتا ہے۔ ونگار دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جس میں زمیندار اپنی زمین پر چاول کی کاشت کے لیے مزدوروں کو بلاتا ہے۔ ایک ایکڑ پر ایک دن میں دس سے پندرہ مرد اور عورتیں چاول کی پنیری لگانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کو ایک وقت کے کھانے اور چائے سمیت 2,000 روپے مزدوری دی جاتی ہے جو ان تمام افراد میں برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔ اگر زمیندار ایک وقت کا کھانا نہیں دیتا تو پھر اجرت 2,500 روپے مل جاتی ہے۔ دوسری طرح کا ونگار دیہاتوں کی سطح پر مشترکہ مدد کے تحت کیا جاتا ہے جس میں ایک علاقے / دیہات کے لوگ ایک دوسرے کی زمین پر باہمی اتحاد کے طور پر چاول کی بوائی کرتے ہیں۔

اسی گاؤں میں چاول کی کٹائی کرنے والی مزدور عورت کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر چار افراد کو چاول کی کٹائی کرنے میں دو سے تین دن لگتے ہیں۔ اس مزدوری کی مد میں ایک من چاول دیا جاتا ہے جو تھریشر میں صفائی کے بعد صرف بیس کلو چاول اور بیس کلو بھوسا بن جاتا ہے۔ عورتیں صبح آٹھ سے شام چار بجے تک چاول کی کٹائی کرتی ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ چاول کی روٹی ان کے علاقے میں شوق سے استعمال کی جاتی ہے۔ چاول کی کٹائی کے موسم میں 8-7 ایکڑ پر ہی مزدوری کر پاتی ہیں جس سے آٹھ

من چاول ملتا ہے جو صفائی کے بعد چار من رہ جاتا ہے۔ یہ چاول چھ سات مہینے سے زیادہ نہیں چل پاتا۔ چاول کا بھوسا جانوروں کی خوراک کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

زیریں سندھ کے ضلع ماتلی کے گاؤں ھالیجی میں چاول کی کٹائی کرنے والی عورت نورجہاں کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر چاول کی پنیری کی بوائی کے لیے دس مزدور ہوتے ہیں جو ایک دن میں پنیری لگانے کا کام مکمل کر لیتے ہیں۔ اس ایک ایکڑ پر چاہے جتنے بھی مزدور ہوں اجرت 1,200 روپے ہی دی جاتی ہے جو تمام مزدوروں میں برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اب یہ زمیندار کی مرضی پر ہے کہ وہ جلدی زمین پر کام ختم کرانا چاہتا ہے تو زیادہ مزدوروں کو بوائی کے لیے رکھتا ہے جس کی وجہ سے 1,200 اوپر کی اجرت تقسیم ہوکر مزید کم ہو جاتی ہے۔

اسی گاؤں میں چاول کی کٹائی کرنے والی کسان مزدور عورت کنڈل کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ کٹائی پر دس سے بارہ عورتیں مل کر مزدوری کرتی ہیں۔ صبح سات بجے سے شام پانچ بجے تک چاول کی کٹائی کرتی ہیں اور اکثر اوقات یہ مزدور عورتیں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھاتیں۔ ایک ایکڑ پر کٹائی کے دس سے بارہ مزدور عورتوں کو دو سے ڈھائی من چاول دیے جاتے ہیں جو ان میں برابر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک عورت کے حصے میں10-8 کلو چاول سے زیادہ نہیں آتا۔ ان کا کہنا تھا چاول کی کٹائی تقریباً15-5 دن چلتی ہے۔ اس دوران میں ایک عورت8-7 ایکڑ پر ہی چاول کی مزدوری کر پاتی ہے اور اس طرح کم سے کم 56 کلو یا زیادہ سے زیادہ دو من چاول حاصل کر پاتی ہے۔

ایک ایکڑ پر گندم کی کٹائی کا معاوضہ دو سے ڈھائی من گندم مل رہا ہے جبکہ اسی ایک ایکڑ پر چاول کی کٹائی پر ایک من چاول دیا جارہا ہے آخر ان دونوں فصلوں میں دی جانے والی اجناس میں اتنا فرق کیوں ہے؟ ہم نے اس غذائی اجناس کے فرق کو سمجھنے کے لیے گھوٹکی کے مقامی کسان سے معلومات حاصل کی جن سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ عورتوں کو دی جانے والی ان اجرتوں کا دارو مدار حکومت کی طرف سے لگائے گئے اجناس کے نرخ پر منحصر ہوتا ہے چونکہ پچھلے تین چار سالوں میں چاول کا نرخ بہت زیادہ رہا ہے اور تقریباً ایک من چاول کے نرخ 2,600 روپے مقرر کیے گئے تھے۔ گندم کے نرخ 1,000-1,200 روپے کے درمیان مقرر کی جاتی ہے۔ اس لیے وہ دو من دے دی جاتی ہے۔ اجرت کی اس شرح کی یقیناً مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

کپاس:

کپاس کی فصل پاکستان کی اہم نقد آور اور درآمدی فصلوں میں سے ایک ہے۔ اس فصل کی چنائی دیہی مزدور عورتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں چھوٹی عمر سے بچیاں اپنی ماؤں کے ساتھ کپاس کی چنائی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ کپاس کی فصل مجموعی ملکی پیداوار کا 1.5 فیصد حصہ فراہم کرتی ہے اور کپڑے کی صنعت کا اہم خام مال بھی ہے۔[17] مقامی اخبار دی ایکسپریس ٹریبون کے مطابق اربوں ڈالرز کی کپڑے کی صنعت کپاس چننے والی عورتوں کے کندھوں پر ٹکی ہوئی ہے جنہیں سخت گرمی میں چنائی کی یومیہ اجرت 150 روپے سے بھی کم دی جاتی ہے[18] کپاس کی چنائی کا عمل عام طور سے زرعی مزدور عورتوں کے ہی سپرد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کام کو مرد کم درجہ کا سمجھ کر نہیں کرتے۔ اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے زرعی مزدور مرد اکثر اپنے خاندان کے ارکان کے ساتھ کپاس کی چنائی میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک مقامی کسان کے مطابق کپاس کی فصل کی بوائی بالائی سندھ میں اب مئی میں ہوتی ہے۔ جبکہ زیریں سندھ میں یہ بوائی جون میں کی جاتی ہے۔ کپاس کی چنائی کا عمل اکتوبر کے اوائل میں شروع ہوتا ہے جو نومبر تک جاتا ہے۔ اس لیے اکثر کسان گندم دیر سے کاشت کرتے ہیں جس کی وجہ سے انکی پیداوار بھی صحیح نہیں ہو پاتی۔

زیریں سندھ کے ضلع ٹنڈو محمد خان کے گاؤں عمریو بھیل میں کپاس کی چنائی کرنے والی ہندو مزدور عورت سینت کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں مسلمان ہاری گھرانوں کی عورتیں کپاس کی چنائی میں حصہ لیتی ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ہمارے علاقے میں پہلے کپاس بہت زیادہ کاشت کی جاتی تھی، اب کم کاشت ہوتی ہے کیونکہ کپاس کی فصل سے زمینداروں کو فائدہ نہیں ہورہا ہے''۔ اسی حوالے سے مقامی اخبار ڈان کا کہنا ہے کہ سندھ میں کپاس کی کاشت کا رجحان تیزی سے ختم ہورہا ہے جس کی وجہ حکومت کی جانب سے کپاس کی امدادی قیمت میں کمی قرار دی جاتی ہے۔[19]

ٹنڈو محمد خان کی ہندو برادری کی مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ کپاس کی کل تین چنائی ہوتی ہیں۔ اکثر مزدور عورتیں صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک بھی چنائی کریں تو بمشکل 20-30 کلو کپاس چن پاتی ہیں۔ جس کی اجرت125 سے190 روپے تک دی جاتی ہے۔ اگر کوئی عورت بہت تیز چنائی کرے اور دن کا کھانا بھی نہ کھائے تب کہیں جاکے وہ ایک من کپاس چن سکتی ہے۔ عورتیں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کپاس کی چنائی کرنا چاہتی ہیں۔ مزدور عورتوں کا مزید کہنا تھا کپاس کی پہلی چنائی میں چونکہ فصل زیادہ ہوتی ہے اس لیے جلدی چنائی ہو جاتی ہے جبکہ دوسری اور تیسری چنائی میں کپاس چننا مشکل ہے۔ کپاس کی چنائی کا عمل دو سے ڈھائی مہینہ چلتا ہے۔ ایک عورت کو فی من کپاس چننے کی اجرت250 روپے دی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک مزدور عورت کپاس کی چنائی کے پورے موسم میں 3,000-4,000 روپے کمالیتی ہے۔ کپاس کی چنائی چونکہ مزدور عورتوں کے لیے نقد رقم کا ذریعہ بھی ہے اس لیے صوبہ سندھ میں تقریباً پانچ لاکھ عورتیں کپاس کی چنائی سے وابستہ ہیں۔[20]

گنا:

بالائی سندھ میں ضلع گھوٹکی کے ایک گاؤں عبدالرزاق سبزوئی میں بہت سی مزدور عوتیں اپنے گھر کے مردوں کے ساتھ گروہ کی صورت میں گنے کی کٹائی میں حصہ لیتی ہیں۔ ایک مزدور عورت کا کہنا تھا کہ 12-10 لوگ اکھٹے ہوکر گنے کی کٹائی کرتے ہیں۔ اس گروہ میں چار سے پانچ مزدور عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ اس میں ایکڑ کی کٹائی کا حساب نہیں ہوتا بلکہ من کی کٹائی، چھلائی اور ٹرالی میں لوڈنگ کے حساب سے اجرت

دی جاتی ہے۔ ایک من گنے کے یہ تمام کام کرنے کے بعد 17 روپے اجرت دی جاتی ہے۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک گنے کی کٹائی کرتی ہیں۔ اس مزدور عورت کے مطابق زمیندار زیادہ تر 500 من ٹرالی بھرنے کے بعد پیسے دیتا ہے جو 8,000 روپے سے اوپر بنتے ہیں اور تمام مزدوروں میں برابر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام اجرت مرد وصول کرتے ہیں ان کو علم نہیں کہ یہ اجرت کتنے دنوں پر دی جاتی ہے۔ گنے کی فصل 12 مہینے چلتی ہے۔ سال کے آٹھویں مہینے میں اس کی کٹائی کا عمل شروع ہوتا ہے جو چار مہینے جاری رہتا ہے۔

گنے کی فصل پر ملنے والی اجرت کے حوالے سے ٹنڈو محمد خان کے گاؤں وسایو بھیل میں کسان مزدور عورت میراں کا کہنا تھا کہ ان کے علاقے میں زیادہ تر عورتیں گنے کی بوائی اور کٹائی میں حصہ لیتی ہیں۔ حلیمہ نے بتایا کہ ایک ایکڑ پر گنے کے بیج لگانے کے لیے زمیندار تقریباً 15 لوگوں کو اجرت پر رکھتا ہے۔ زمین پہلے سے تیار ہوتی ہے۔ بیج تقریباً ایک گھنٹے میں بو دیا جاتا ہے۔ مردوں کی بوائی کی اجرت 200 روپے ہے جبکہ عورتوں کو اس کے صرف 150 روپے اجرت دی جاتی ہے۔ میراں کا کہنا تھا کہ گنے کی بوائی کے لیے گنے کو ٹرالی میں بھر کر لانے اور اس گنے کی برابر کٹائی مرد کرتے ہیں اس لیے ان کو اجرت زیادہ دی جاتی ہے۔ گنے کی کٹائی کے حوالے سے ایک اور مزدور عورت حلیمہ کا کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر 8 مزدور (مرد اور عورتیں) اس کی کٹائی میں حصہ لیتے ہیں۔ آٹھ مزدور ایک ایکڑ پر تین دن میں کٹائی پوری کرتے ہیں۔ یہ صبح آٹھ بجے سے 12 بجے تک گنے کی کٹائی کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ جاتی ہیں۔ گنے کو کاٹنا اور چھیلنے کا کام عورتیں کرتی ہیں جبکہ اس کو باندھنے اور ٹرالی میں بھرنے کا کام مردوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ جس زمین پر عورتیں بوائی میں حصہ لیتی ہیں اسی زمین پر کٹائی بھی کرتی ہیں۔ حلیمہ کا مزید کہنا تھا کہ ان کے شوہر اور ان کو خود ایک من گنا کاٹنے کے دس روپے ملتے ہیں۔ اس کی اجرت پہلے آٹھ روپے دی جاتی تھی اب دس روپے دی جاتی ہے۔ ان کے علاقے میں گنے کی کٹائی کے لیے تھر سے کوہلی برادری بھی مزدوری کرنے آتی۔

سبزیاں

پیاز:

گھوٹکی سندھ میں کچے کے علاقے کے گاؤں رئیس اختیار میں زیادہ تر عورتیں گھر کے لیے ٹھیکہ پر لی گئی زمین پر لگنے والی پیاز کی مزدوری کرتی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر عورتیں اپنی اس محنت کو بلا اجرت تصور کرتی ہے۔ جبکہ ان میں سے بیشتر عورتوں کو پیاز کی فصل پر کام کرنے کے باوجود اس بات کا علم نہیں تھا کہ پیاز کی کٹائی کرنے والی عورتوں کو کتنی اجرت فراہم کی جاتی ہے۔ بہت مشکل کے بعد ایسی مزدور عورت فاطمہ سے بات کرنے کا موقع ملا جو دوسرے کی زمین پر پیاز کی اجرتی مزدوری کرتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پیاز کی فصل گندم کی فصل کے دنوں میں ہی کاشت کی جاتی ہے۔ آدھے ایکڑ پر پانچ مزدور تین دن میں بوائی کرتے ہیں۔ بیج لگانے کی مزدوری 6,000 روپے ملتی ہے جو پانچ لوگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پیاز کی چنائی کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ اس کی چنائی اپریل سے مئی تک چلتی ہے۔ آدھے ایکڑ پر چار مزدور پیاز کی چنائی کریں تو چھ دن لگتے ہیں۔ اس فصل کو دراصل زمین کے اندر سے کھود کر نکالنا پڑتا ہے۔ جس کی اجرت مردوں کو 500 جبکہ عورتوں کو 300 روپے دی جاتی ہے۔ ایک من پیاز بازار میں 800-500 روپے میں فروخت کی جاتی ہے۔ ہم نے اجرت کے اس فرق کو معلوم کرنے کے لیے ان کے شوہر سے پوچھا کہ عورتوں کو اس کی اجرت کس وجہ سے کم دی جاتی ہے تو ان کا کہنا تھا کہ مرد صبح آٹھ بجے چنائی پر جاتے ہیں جبکہ عورتیں گھر کا کام کرنے کے بعد دس بجے چنائی کے لیے آتی ہیں اور شام چار بجے واپس جاتی ہیں اس لیے ان کو اجرت کم ملتی ہے۔ جبکہ پیاز کی چنائی اور صفائی کے علاوہ ان کو گانٹھوں میں باندھ کر ایک جگہ اکھٹے کرنے کا کام بھی مزدور عورتیں ہی کرتی ہیں۔

زیریں سندھ میں ٹنڈو محمد خان کے گاؤں عمر یو بھیل میں مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ پیاز کی بوائی ایک نہایت مشکل عمل ہے کیونکہ اس کی بوائی میں بیج بہت ہی کم فاصلوں سے لگانا پڑتا ہے جس میں بہت زیادہ محنت اور وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لیے عام طور سے مرد پیاز کی بوائی نہیں کرتے اور مشکل کام عورتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ پیاز کی بوائی دس سے پندرہ دن تک چلتی ہے جس میں کئی ذاتوں کے ہندو مزدور (کوہلی، بجاری اور بھیل) حصہ لیتی ہیں عورتیں عموماً گندم کی بوائی میں حصہ نہیں لیتیں اس لیے زیادہ تر پیاز کی بوائی کرتی ہیں۔ ایک ایکڑ پر 25 مزدور عورتوں کو پیاز کا بیج لگانے کے 2,000 روپے دیئے جاتے ہیں جو ان میں برابر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں ایک عورت کے حصے میں 80 روپے سے زیادہ نہیں آتے۔ ایک ایکڑ پر 25 مزدور عورتیں ایک دن میں بیج لگانے کا کام پورا کر دیتی ہیں۔ چنائی کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ پیاز کی چنائی میں دو تین مرحلوں میں مکمل کی جاتی ہے پہلے دن پیاز کو زمین سے نکالنے کا کام ہوتا ہے۔ پھر دو سے تین دن اس پیاز کو سوکھنے میں لگتے ہیں۔ پھر اس کی کٹائی اور صاف کر کے اس کو بوریوں میں بھرا جاتا ہے۔ دو مزدور عورتیں ایک دن میں مل کر تین بوریاں بھر لیتی ہیں۔ ایک من بھرنے کے 100 روپے ملتے ہیں۔ ایک بوری میں دو سے ڈھائی من پیاز بھرا جاتا ہے۔ مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ دو عورتیں مل کر دو بوری سے زیادہ نہیں بھر پاتی ہیں۔ اگر ایک عورت اکیلے کام کرے تو سارا دن میں ایک ہی بوری بھر پاتی ہے۔

مرچیں:

ضلع گھوٹکی میں کچے کے علاقے کے گاؤں عبداللہ میرانی میں زیادہ تر عورتیں مرچوں کی چنائی کرتی ہیں۔ ان مزدور عورتوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق مرچوں کے بیج

لگانے کا کام چونکہ بہت آسان ہوتا ہے اس لیے زمیندار یہ کام مردوں سے کے ذمہ لگاتا ہے لیکن مرچوں کی چنائی چونکہ بہت مشکل ہے اس لیے زائد محنت کا کام مزدور عورتوں سے کرایا جاتا ہے۔ مرچ کی فصل کی تیسرے مہینے سے چنائی شروع ہوتی ہے۔ مرچوں کی کل چار چنائی ہوتی ہیں پہلی چنائی 15-16 دن چلتی ہے۔ ایک ایکڑ پر فصل کو اتارنے میں چار مزدور عورتوں کے ساتھ چار دن لگتے ہیں۔ مزدور عورتیں صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک مرچوں کی چنائی کرتی ہیں۔ جو عورتیں گاؤں کے قریب کی فصلوں کی چنائی کرتی ہیں وہ دوپہر میں واپس آ کر کھانا کھالیتی ہیں لیکن دور کھیتوں میں مزدوری کرنے والی عورتوں کو آرام کا موقع نہیں مل پاتا۔ ایک دن میں چار مزدور عورتیں ایک من مرچوں کی چنائی کر لیتی ہیں۔ ان عورتوں کو چنائی کی اجرت بوری بھرنے کے حساب سے دی جاتی ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ من مرچیں بھرنے کے 150 روپے ملتے ہیں جو ان چار مزدور عورتوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ ایک عورت کے حصے میں 37 روپے اجرت کے آتی ہے۔

زیریں سندھ کے ضلع ٹنڈو محمد خان کے گاؤں عمریو بھیل میں مرچوں کی چنائی کرنے والی ہندو مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں زیادہ تر یہ کام عورتیں کرتی ہیں۔ مرد مزدور اس چنائی میں حصہ نہیں لیتے۔ مرد اگر ہاری ہوتے ہیں تو ان کو مجبوری کے تحت اس چنائی کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ اس علاقے میں عورتیں مرچوں کی بوائی میں بھی شامل ہوتی ہیں جس میں ایک ایکڑ پر پانچ مزدور عورتوں کو 600 روپے مزدوری ملتی ہے۔ جو ان میں برابر تقسیم ہوجاتی ہے۔ صبح آٹھ بجے سے 12 بجے تک بیج لگانے کا کام مکمل کرلیا جاتا ہے۔

چنائی کے حوالے ان کا کہنا تھا کہ اس کی اجرت بوری بھرنے کے حساب سے دی جاتی ہے۔ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک دو عورتیں ایک بوری جو ڈھائی من کی ہوتی ہے بھر پاتی ہیں جس کی ان کو 100 روپے اجرت ملتی ہے جو دونوں مزدور عورتوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ مرچوں کی چنائی سے پورے بدن میں مرچیں لگ جاتی ہیں کیونکہ مزدور عورتیں اپنے کمر کے پیچھے مرچیں جمع کرنے کے لیے کپڑا باندھتی ہیں جس میں مرچیں اکھٹی کرتی ہیں۔ تازی اتاری جانے والی مرچیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ ان کے پورے جسم میں جلن شروع ہوجاتی ہے اور مرچیں چننا مشکل ہوجاتا ہے۔

بھنڈی، گوار، ٹماٹر:

ٹنڈو محمد خان کے گاؤں مولا بخش لاشاری میں بھنڈی کی چنائی سے وابستہ مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ بھنڈی کی فصل ڈھائی مہینے کی ہوتی ہے۔ جب گندم پکنے لگتی ہے تب بھنڈی کی بوائی کا موسم ہوتا ہے۔ ان مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ بھنڈی کی چنائی بہت مشکل کام ہے۔ مرد مزدور اس کی چنائی بہت کم کرتے ہیں۔ کیونکہ چنائی کے وقت فصل میں موجود کانٹوں کی وجہ سے ان عورتوں کے ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ گھر کے کام بھی بمشکل کر پاتی ہیں۔ ایک مزدور عورت عنایت کا کہنا تھا کہ وہ صبح سات بجے سے دوپہر 12 بجے تک بھنڈی کی چنائی کرتی ہیں جس کی اجرت فی کٹے کے حساب سے دی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ پر 20-25 مزدور عورتیں ہوتی ہیں۔ پانچ عورتیں ڈھائی من کا کٹا بھر پاتی ہیں جس کی اجرت انہیں 150 روپے ملتی ہے جو ان پانچوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ایک ایکڑ پر زیادہ سے زیادہ چار کٹے بھرے جاتے ہیں۔ جس کی اجرت انہیں دوسرے یا تیسرے دن دی جاتی ہے۔

اسی علاقے میں مزدور عورتیں گوار کی پھلی کی بھی چنائی کرتی ہیں۔ گوار کی فصل چھ مہینے کی ہوتی ہے۔ ایک عورت کو ڈھائی کلو گوار چننے کی 15 روپے اجرت ملتی ہے۔ ایک ایکڑ پر 15-20 عورتیں ہوتی ہیں جو دو سے تین دن میں یہ چنائی کرلیتی ہیں۔ چونکہ گوار سبزی کا پھل زیادہ تعداد میں ہوتا ہے اس لیے اس کو چننا آسان ہوتا ہے۔ عام طور سے عورتیں صبح آٹھ سے دوپہر 12 بجے تک کام کرتی ہیں۔ ایک عورت اتنے وقت میں 5-10 کلو گوار کی چنائی کر لیتی ہے۔

ٹماٹر کی چنائی کے حوالے سے ان مزدور عورتوں کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں زیادہ تر مزدوری ٹھیکے پر کرائی جاتی ہے۔ جس میں کوہلی برادری زیادہ حصہ لیتی

جدول 1 ۔ بالائی سندھ میں کسان مزدور عورت کی اجرت

فصل	چنائی / کٹائی	کل مزدور عورتیں	وزن	ایکڑ	وقت	ایک عورت کی ایک دن کی اجرت
گندم	کٹائی (ہاتھ سے)	4	دو سے ڈھائی من	1	دو دن	12 کلو گندم، 396 روپے ❖
گندم	کٹائی (مشین)	2	ایک من	1	دو دن	10 کلو گندم، 330 روپے
چاول	کٹائی	4	ایک من	1	دو سے تین دن	5 کلو چاول، 100 روپے ◆
گنا	کٹائی	4-5	ایک من	معلوم نہیں	معلوم نہیں	-*
پیاز	چنائی	4	دو سے ڈھائی من	1	پانچ دن	15 روپے
مرچیں	چنائی	4	ڈیڑھ من	1	دو دن	19 روپے

❖ فی کلو گندم کی قیمت 33 روپے۔

◆ عورتوں کو مزدوری کی مد میں 10 کلو چاول ملتا ہے جو صاف ہونے کے بعد پانچ کلو رہ جاتا ہے اور پانچ کلو بھوسہ بچ جاتا ہے جس کی قیمت تقریباً 8 روپے فی کلو ہے۔

* گنے کی اجرت فی من دی جاتی ہے لیکن یہ اجرت ان عورتوں کے ہاتھ نہیں آتی۔

جدول 2۔ زیریں سندھ میں کسان مزدور عورت کی اجرت

فصل	چنائی/ کٹائی	کل مزدور عورتیں	وزن	ایکڑ	وقت	ایک عورت کی ایک دن کی اجرت
گندم	کٹائی	5	ڈیڑھ من	1	تین دن	4 کلو گندم۔ 132 روپے ❖
چاول	کٹائی	10-12	دو سے ڈھائی من	1	ایک دن	4.5 کلو چاول۔ 90 روپے ◆
گنا	کٹائی	8	ایک من	1	تین دن*	-
کپاس	چنائی	1	ایک من	ایک ایکڑ	دو دن	125 روپے
پیاز	چنائی	2	ایک من	1	پانچ دن	10 روپے
مرچیں	چنائی	2	ڈھائی من	1	ایک دن	50 روپے
بھنڈی	چنائی	5	ڈھائی من	1	ایک دن	30 روپے
گوار کی پھلی	چنائی	17	ڈھائی کلو	1	ایک دن	15 روپے
ٹماٹر	چنائی	9	20 کلو	1	دو سے تین دن	40 روپے

❖ فی کلو گندم کی قیمت 33 روپے۔

◆ عورتوں کو مزدوری کی مد میں 9 کلو چاول ملتا ہے جو صاف ہونے کے بعد ساڑھے چار کلو رہ جاتا ہے اور ساڑھے چار کلو بھوسہ بچ جاتا ہے کی قیمت تقریباً 8 روپے کلو ہے۔

* گنے کی کٹائی کرنے والی مزدور عورتیں صبح 8 سے دوپہر 12 بجے تک کام کرتی ہیں۔لیکن اجرت عورتوں کے ہاتھ میں نہیں آتی۔

جدول 3۔ بیج کی بوائی کی مد میں کسان مزدور عورتوں کو دی جانے والی اجرت

فصل	کل مزدور عورتیں	ایکڑ	وقت	ایک دن کی اجرت
چاول (بالائی سندھ)	10-15	1	ایک دن	156 روپے
چاول (زیریں سندھ)	10	1	ایک دن	120 روپے
گنا (زیریں سندھ)	15	1	ایک دن	150 روپے
پیاز (بالائی سندھ)	5	آدھا ایکڑ	تین دن	400 روپے
پیاز (زیریں سندھ)	25	1	ایک دن	80 روپے
مرچیں (زیریں سندھ)	5	1	آدھا دن	120 روپے

ہے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ٹھیکے پر مزدوری کرنے والوں کس حساب سے اجرت دی جاتی ہے۔ٹماٹر کی فصل چھ مہینے کی ہوتی ہے۔ دس کلو ٹماٹر کا بورا بھرنے کے ایک عورت کو 20 روپے ملتے ہیں۔ پہلے اس کی اجرت 15 روپے تھی ابھی بھی کئی جگہوں پر عورتوں کو اس کی مزدوری 15 روپے ہی مل رہی ہے۔ صبح سات بجے سے دوپہر ایک بجے تک ایک عورت دو بوروں سے زیادہ نہیں بھر پاتی۔ ایک ایکڑ پر 8-10 مزدور عورتیں کام کرتی ہیں جو دو سے تین دن میں ایکڑ کی چنائی کرتی ہیں۔

پیش کردہ جدول 1 اور 2 میں بالترتیب بالائی اور زیریں سندھ میں کسان مزدور عورتوں کو دی جانے والی اجرتوں کو تفصیلی پیش کیا گیا ہے جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان مزدور عورتوں کے کام کے حالات، نوعیت اور اجرتوں کے لیے کسی طرح کا کوئی قانون لاگو نہیں ہے۔ بوائی کی اجرت بھی انتہائی کم ہے (جدول 3) زمیندار کی مرضی ہے وہ جب چاہے جتنے مزدوروں سے جتنے رقبے پر کام کراتا ہے اور ایک مخصوص رقم تمام مزدوروں میں تقسیم ہوکر مزید کم ہو جاتی ہے۔ جبکہ سبزیوں کی جو اجرتیں عورتوں کو دی جارہی ہیں وہ سراسر استحصال اور ناانصافی ہے۔

حاصل کردہ معلومات سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بالائی سندھ میں ایک ایکڑ پر زیادہ سے زیادہ چار مزدوروں سے کام کروایا جارہا ہے جبکہ زیریں سندھ میں زیادہ تر ہندو برادری بے زمین ہونے کی وجہ سے اجرتی مزدوری سے وابستہ ہے لہٰذا مزدور عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں مزدوری کی مد میں دیئے جانے والے غذائی اجناس میں مزید کٹوتی کردی جاتی ہے جو ان مزدور عورتوں میں تقسیم ہوکر ایک دن کی خوراک کے لیے بھی ناکافی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ معلومات کچھ گاؤں کی کسان مزدور عورتوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اتنی محدود معلومات کے بعد بھی ہمیں ایک ہی صوبے میں مزور عورتوں کی اجرت کے رجحانات میں اتنا فرق نظر آتا ہے تو سوال یہ ہے کہ پورے ملک کی کسان مزدور عورتوں کے کام کے حالات اور اجرتوں کی نوعیت کیا ہوگی؟ ضرورت اس امر کی ہے اس حوالے سے وسیع پیمانے پر تحقیق کی جائے جس میں پورے ملک میں زرعی اجرتی مزدور عورتوں کی افرادی قوت اور اس مد میں دی جانے والی اجرتوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ ہمارے ملک کی حکومتوں اور ان کی طرف سے جاری کردہ رپورٹوں اور اعداد وشمار کو منہ توڑ جواب دیا جاسکے۔

(حوالہ جات صفحہ نمبر 6 پر دیکھیں)

کشمیر اور گلگت بلتستان میں مال مویشی کی دیکھ بھال: عورتوں کا کردار

تحریر: آسیہ کشمیری اور علی احمد جان

آزاد کشمیر میں عورتیں مئی سے اکتوبر تک مویشی لے کر ''بیک'' میں جاتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر مویشیوں کو گرمیوں میں گاؤں میں رکھیں تو سردیوں کے لیے چارہ نہیں بچایا جاسکتا اس لیے مقامی لوگ بیک میں جاتے ہیں تاکہ مال مویشی کی موجودہ اور سردیوں کی ضرورت کے لیے چارہ جمع کرسکیں۔ بیک ہندکو زبان کا لفظ ہے جس سے مراد مستقل رہائشی گاؤں سے چند مخصوص مہینوں کے لیے پہاڑوں پر جانا ہے۔ مئی میں جب بارشیں شروع ہوتی ہیں تو گاؤں میں موجود سردیوں کی بچی ہوئی گھاس یا بازار سے بھوسا لے کر مویشیوں کو مزید اونچائی پر میدانی علاقوں میں چرانے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ بیک میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتیں بھی جاتی ہیں جو زیادہ تر آپس میں رشتے دار ہوتی ہیں اور سب مل کر جاتی ہیں۔ گاؤں سے بیک آنے جانے کے لیے پہاڑی راستے پر سات سے آٹھ گھنٹے لگتے ہیں اس لیے عورتیں جب بیک جاتی ہیں یا گاؤں واپس آتی ہیں تو دو تین عورتیں مل کر جاتی ہیں یا کوئی رشتہ دار یا ہمسائے کا کوئی مرد ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیک کے لیے ایک خاندان سے ایک یا دو عورتیں جاتی ہیں، کسی ایک گھر سے ایک عورت بھی ہوتی ہے زیادہ تر لوگ گاؤں میں گھروں پر ہی رہتے ہیں۔ ہر عورت کے پاس اپنے چار سے پانچ جانور ہوتے ہیں جن میں گائے، بکری، بھیڑ شامل ہوتے ہیں۔

بیک میں استعمال ہونے والا سامان مثلاً کھانے پینے کی اشیاء، کپڑے، بستر وغیرہ عورتیں خودلیکر جاتی ہیں اور اکثر مرد بھی یہ سامان لے کر جاتے ہیں یا پھر گدھے پر لاد کر لے جایا جاتا ہے۔ مرد ریوڑ چرانے والوں سے گدھا مستعار لیتے ہیں۔ بیک پر جانے والے گھرانوں کی ایک عورت گھر پر ہی رہتی ہے جو مویشیوں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے انہیں چارہ ڈالتی اور ساتھ گھر کے کام بھی کرتی ہے۔

بیک میں جانے والی عورتیں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتی ہیں جو انہیں مرد بنا کر دیتے ہیں۔ عورتیں کھانا پکانے کے لیے جھونپڑیوں کے اندر مٹی کے چولہے بناتی ہیں اس میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلانے اور کھانا پکانے کا انتظام کرتی ہیں۔ مویشی کھلے آسمان تلے ہوتے ہیں اچانک بارش ہوجائے یا کسی جنگلی جانور کا خطرہ ہو تو بہت مشکل پیش آتی ہے۔ جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لیے آگ جلا کر رکھی جاتی ہے۔

بیک میں عورتوں کے ذمہ کئی کام ہوتے ہیں۔ مویشیوں سے حاصل ہونے والے دودھ سے مکھن، گھی، لسی اور دیگر مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔ ایک عورت کو ایک گائے کا دودھ دوہنے میں ایک گھنٹا لگتا ہے اور ایک بکری کا دودھ دوہنے میں بیس منٹ لگتے ہیں۔ بھیڑ کا بچہ اس کے ساتھ ہی رہتا ہے اس لیے اس سے دودھ نہیں لیا جاتا۔ عورتیں دودھ کو کسی مٹی کے برتن میں جمع کرتی ہیں جسے ٹھنڈی جگہ پر تقریباً پندرہ تک رکھتی ہیں۔ پانچ سے چھ کلو دودھ سے لسی بنانے میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ لسی تیار ہونے پر مکھن سطح پر آجاتا ہے جسے کسی برتن میں جمع کرتے جاتے ہیں۔ دو سے تین کلو مکھن تیار ہونے پر اس مکھن کو آگ پر رکھ کر گرم کرتے ہیں جو پکنے کے بعد گھی بن جاتا ہے، پھر اس گھی کو ململ کے کپڑے میں چھان لیا جاتا ہے۔ اس چھاننے کے عمل میں بھی ایک گھنٹا لگتا ہے۔ ایک دیگچہ بھرلسی سے پنیر بنایا جاتا ہے اسے بھی گرم کرکے باریک کپڑے میں چھان کر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے اس پنیر سے سردیوں میں سالن بنایا جاتا ہیں۔

اگر کسی اور کے مویشی بیک پر لے کر جاتے ہیں تو اس کی رکھوالی کا معاوضہ جانور کے حساب سے ملتا ہے۔ مثلاً دو جانور کے دو ہزار روپے ملتے ہیں چار ہوں تو چار ہزار۔ چھوٹے جانوروں کا معاوضہ کم ہوتا ہے جیسے کہ بکری بھیڑ کے پانچ سے سات سو روپے تک ملتے ہیں۔ اگر کوئی جانور رکھوالی کے لیے لیتے ہیں تو اس کا دودھ مویشی کے مالک کی خواہش کے مطابق اکٹھا کرکے رکھتے ہیں۔ اپنے جمع کیے گئے دودھ کے ساتھ یا علیحدہ، مالک لسی، مکھن کا کہیں تو ان کو لسی، مکھن ہی دیتے ہیں۔ اگر گاؤں میں لسی کی ضرورت ہے تو گاؤں جانے والے فرد کے ہاتھ لسی گاؤں بھیج دیتے ہیں۔ معاوضہ صرف جانور کی رکھوالی کا لیا جاتا ہے لیکن باقی تمام کام بھی اسی میں شامل ہوتے ہیں۔

بیک میں ہر گھر سے ایک عورت دن بھر مویشوں کا خیال رکھتی ہے کیونکہ وہاں پر راستے دشوار ہوتے ہیں اس لیے بڑے جانور گائے وغیرہ کے ساتھ بھی رہنا پڑتا ہے اور شام میں گھر کے کام اور کھانا بھی بنانا ہوتا ہے۔ بیک میں موجود سات آٹھ گھرانوں کی بھیڑ، بکریاں جمع کریں تو ان کی تعداد تقریباً چالیس پچاس تک ہوتی ہے۔ ان جانوروں کو صبح چراگاہ میں چھوڑا جاتا ہے اور شام میں واپس لے کر آنا ہوتا ہے کیوں کہ بھیڑ، بکریاں چھوٹے جانور پہاڑوں پر جاسکتے ہیں اور تنگ راستوں میں پھنس سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیک کے شروع کے مہینوں میں ابھی برف ہوتی ہے اس لیے رکھوالی کے لیے چھوٹے جانوروں کے ساتھ بھی رہنا پڑتا ہے۔ برف کم یا ختم ہونے کے بعد چھوٹے جانوروں کی رکھوالی کم کرنی پڑتی ہے۔ بیک پر آئی ہوئی عورت کو اگر کسی کام سے واپس گاؤں جانا ہو تو وہ اپنے مویشی ہمسائے کے سپرد کرتی ہے اور کسی ہمسائے یا کسی عورت کے ساتھ واپس گاؤں جاتی ہے۔ اکثر دو تین دن کے لیے گاؤں واپس آکر کھیت کو پانی دینا ہوتا ہے یا گھاس کاٹنی ہوتی ہے جس کے بعد عورتیں واپس بیک میں چلی جاتی ہیں۔

یہاں کے بالائی میدانی علاقوں میں جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بیک

پر جانے والی عورتیں جڑی بوٹیاں بھی جمع کرتی ہیں جس سے دوائیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں میں کھٹ، رتن جوت، بن گوجی، بنفشہ شامل ہیں جنہیں سردیوں میں مقامی لوگ چاول میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ کمر درد میں بھی ان جڑی بوٹیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں میں سے زیادہ تر رتن جوت استعمال ہوتی ہے۔ بیک میں قیام کے دوران عورتیں پہاڑوں پر سے جنگلی سبزیاں اور ساگ لاکر سردیوں کے لیے جمع کرتی ہیں جنہیں گرم پانی میں ابال کر سالن بنایا جاتا ہے۔ کشمیر میں سردیوں میں کوئی فصل نہیں ہوتی ہر طرف صرف برف ہوتی ہے۔ بازار میں سبزی ملتی ہے لیکن موسم سرما میں بازار جانا مشکل ہوتا ہے برف باری سے راستے بھی بند ہو جاتے ہیں اس لیے سردیوں کے لیے سبزیاں اور دیگر اشیاء ضروریات پہلے سے ہی ذخیرہ کرلی جاتی ہیں۔

عورتیں پانچ سے چھ مہینے بیک میں رہنے کے بعد گاؤں واپس آتی ہیں۔ نومبر میں مویشیوں کو اندر باندھ دیا جاتا ہے اور وہ گھاس اور چارہ جو گرمیوں میں جمع کیا جاتا ہے وہ پوری سردی استعمال کیا جاتا ہے۔

سردیوں میں پہاڑوں پر برف پڑتی ہے تو گلیشئر بنتے ہیں۔ گرمیوں میں جب بارش ہوتی ہے تو پانی کے ساتھ مٹی اور برف کے تودے بھی آتے ہیں جو اکثر پلوں کو ساتھ بہاکر لے جاتے ہیں اس لیے ہر سال گرمیوں میں جب نالے میں پانی زیادہ آتا ہے تو نیا پل کا بنانا ضروری ہوتا ہے۔ گاؤں کے چھ سے سات مرد تین سے چار دن میں پل بناتے ہیں۔ اس پل کے ذریعے مویشیوں کو چراگاہوں میں لے جایا جاتا ہے۔

بیک کے آخری مہینوں میں گھاس کی کمی ہوجاتی ہے۔ جون، جولائی میں تو گھاس ہوتی ہے لیکن اگست، ستمبر میں جب گھاس کم ہوجاتی ہے تو عورتیں پہاڑوں پر جاتی ہیں اور وہاں سے گھاس یا برج اور چنار کے پتے توڑ کر لاتی ہیں جو صبح شام مویشیوں کو ڈالتی ہیں۔

بیک کے دوران عورتیں ساتھ ساتھ دست کاری کا کام بھی کرتی ہیں۔

بیک میں دودھ دینے والے مویشیوں کے علاوہ بھیڑیں بھی پالی جاتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ بھیڑوں سے دودھ نہیں نکالا جاتا ان سے اون حاصل کیا جاتا ہے۔ بھیڑ کی اون زیادہ مرد کاٹتے ہیں عورتیں بھی یہ کام کرتی ہیں مگر کم۔ ایک بھیڑ کی اون سے ایک لوئی بن سکتی ہے جسے بالکل ہلکی رضائی یا پھرکھیس کہہ سکتے ہیں جو بہت گرم ہوتی ہے۔ اس اون کو یونہی بغیر صاف کیے رکھ لیا جاتا ہے۔ سردیوں میں اون کو دھوکر سوکھایا جاتا ہے۔ پہلے عورتیں اون کو چرخے پر کات کر دھاگہ بناتی ہیں جو پانچ سے سات مہینے میں تیار ہوتا ہے۔ پھر اس دھاگے کو لوئی بنانے والے کو دے دیا جاتا ہے۔ لوئی یا رضائی بنانے والے مرد ہوتے ہیں جنہیں کشمیر میں جلائی کہتے ہیں۔ رضائی تو دو سے تین سال میں ختم ہوجاتی ہے لیکن لوئی کو دس سال استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لوئی سے چادریں بھی بنائی جاتی ہیں جسے مرد بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ اس لوئی سے عورتیں اپنے لیے جبہ بناتی ہیں جسے کشمیری زبان میں پیرن کہتے ہیں۔

گلگت بلتستان پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق 28,000 مربع میل پر پھیلے اس خطے کی کل آبادی 870,347 ہے۔ قراقرم کے پہاڑی سلسلے میں واقع اس خطے کی زیادہ تر وادیاں 10,000 فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ گلگت بلتستان کی 86 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور کاشت کاری سے منسلک ہے۔ دیہات کے رہنے والے زمین کے چھوٹے سے رقبے کے مالک ہوتے ہیں اور مال مویشی پالتے ہیں ان میں بھیڑ، بکریاں، گائے، بیل اور گدھے شامل ہیں جو کسی نہ کسی طرح ان کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ ضلع غذر اور اسکردو کے کچھ علاقوں میں خوش گاؤ (یاک) بھی پالا جاتا ہے۔

پہاڑوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے یہاں کی وادیوں میں موسم سرما طویل اور موسم گرما کی مدت مختصر ہوتی ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں مارچ کے آخری ہفتے اور اپریل کی وسط تک تخم ریزی (pollination) کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ زیریں علاقوں میں کاشتکاری کے بعد مال مویشی کو چرانے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس لیے اپریل کے اواخر اور مئی کے اوائل میں کچھ خاندان دو سے ڈھائی ماہ کے لیے بالائی علاقوں (جسے نالہ کہا جاتا ہے) کی طرف عارضی ہجرت کر جاتے ہیں۔ یہ نالہ جات گاؤں سے کم سے کم ڈیڑھ اور زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہوتے ہیں۔ کچھ خاندان صرف اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے مال مویشیوں کو ساتھ لے جاتے ہیں اور کچھ علاقوں میں ایک خاص طبقے کا پیشہ ہی گاؤں کے لوگوں کے مال مویشیوں کو چرانا ہے جنھیں خانہ بدوش بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ افراد چند ماہ کے لیے ایسے علاقوں میں قیام کرتے ہیں جہاں قدرتی چراگاہیں ہوں اور جانوروں کے لیے گھاس موجود ہوں۔ جب انھیں لگتا ہے کہ اس چراگاہ میں جانوروں کے لیے مزید خوراک باقی نہیں تو وہ دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ ہر چند کہ اس دوران تمام مال مویشیوں کی حفاظت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے لیکن کسی جانور کے کھو جانے یا مرجانے کی صورت میں مالکان بدلے میں کچھ طلب نہیں کرتے ہیں۔

ان نالہ جات میں رہنے کے لیے پتھروں اور درختوں کی ٹہنیوں کی مدد سے جھونپڑیاں اور بعض جگہوں میں کچے گھر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ جانوروں مثلاً بھیڑ بکریوں کو صبح چراگاہ لے جایا جاتا ہے اور شام کو واپس لایا جاتا ہے کیونکہ جنگلی جانوروں کا خطرہ ہوتا ہے۔ جبکہ بیل اور دودھ نہ دینے والے جانوروں کو ہر شام واپس لانا ضروری نہیں سمجھا جاتا کیونکہ جنگلی جانوروں سے انھیں کم خطرہ ہوتا ہے اور یہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ ان جانوروں کا چراگاہوں میں رات گزارنا چراگاہوں کے لیے بھی فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ ان چراگاہوں میں کوئی انسان گھاس نہیں اگاتا اور نہ

ہی کوئی کھاد ڈالتا ہے۔ ان جانوروں کے رات کو وہاں ٹھہر جانے سے زمین کو کھاد ملتی ہے اور بارشوں کے بعد چراگاہیں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔

ضلع ہنزہ نگر اور گانچھے میں یہ کام صرف مرد سرانجام دیتے ہیں جبکہ ضلع غذر اور دیامر میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی یعنی پورا خاندان بالائی علاقوں کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ ان علاقوں میں دوران ہجرت زیادہ تر کام عورتوں کے ذمے ہوتے ہیں مثلاً مال مویشی کا حساب کتاب، دودھ دوہنا، لسی بنانا، مکھن تیار کرنا، کھانا پکانا، بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ۔ عورتیں تمام جانوروں کا دودھ دوہتی ہیں۔ عام طور پر 50 سے 100 بھیڑ بکریاں اور درجنوں گائیں ہوتی ہیں جن سے روزانہ دو مرتبہ دودھ دوہنا ہوتا ہے۔ دودھ سے بنی دیگر مصنوعات بنانے کا کام نہایت محنت طلب ہوتا ہے۔ مثلاً 'قوروت' بنانا۔ لسی کو تیز آگ پر گھنٹوں پکانے کے بعد پھر دھوپ میں رکھ کر سکھایا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے وافر مقدار میں لکڑیوں کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ لسی کو نہایت گاڑھا ہونے تک پکایا جاتا ہے اور ایک فرد مسلسل اس کی نگرانی کرتا ہے جو عموماً عورت ہوتی ہے۔ 'قوروت' کو بطور سرکہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سینے میں جلن اور متلی کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پنیر، دہی، چکہ (لسی کو ململ کے کپڑے میں چھان کر بنایا جاتا ہے) بھی بناتے ہیں۔ مکھن اور قوروت کے علاوہ دودھ سے بننے والی دیگر مصنوعات کا مال مویشی کے مالک تک پہنچانا ضروری نہیں ہوتا۔ البتہ بوقت ضرورت منگوایا جاسکتا ہے۔ ضلع غذر کے بیشتر گاؤں میں دو طرح کے لوگ نالہ جات کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔

1۔ معاشی طور پر کمزور خاندان

معاشی طور پر کمزور افراد گاؤں کے دیگر خاندانوں کے مال مویشیوں کو بھی لے کر نالہ جات کی طرف ہجرت کرتے ہیں جو اس مدت کے دوران جانوروں کی دیکھ بھال، دودھ دوہنا، مکھن بنانا غرض جانوروں کے متعلق تمام کام سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے بدلے میں انھیں ایک مقررہ مقدار میں اشیائے خورد و نوش ملتا ہے جس میں ایک من آٹا، ایک کلو چائے کی پتی، ایک کلو چینی، کپڑے دھونے والے صابن وغیرہ شامل ہیں۔ دو ماہ بعد وہ جانوروں کو مالکان کو مکھن سمیت واپس لوٹاتے ہیں۔ چونکہ یہ افراد معاشی طور پر کسمپرسی کا شکار ہوتے ہیں، ان دو مہینوں میں اتنا کما لیتے ہیں کہ اگلے موسم تک گزارہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی خاندان دیگر 15 گھرانوں کے مال مویشی لے کر جاتا ہے تو تمام 15 گھرانوں کو مقررہ اشیائے خورد و نوش دینا لازم ہے۔ یوں وہ 15 من آٹا، پندرہ کلو چینی، چائے پتی وغیرہ جمع کرلیا ہوتا ہے۔ کچھ مقامات پر خانہ بدوش خاندان بطور پیشہ یہ کام کرتے ہیں۔ یہ افراد باقاعدہ اس کی اجرت لیتے ہیں جو کہ بھیڑ بکری کی صورت میں ہوتی ہے یا پھر چار سے پانچ ہزار روپے نقد لیتے ہیں۔

2۔ نالہ جات کے زمین مالکان

بالائی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے والے افراد کی دوسری قسم میں وہ افراد شامل ہیں جن کی بالائی علاقوں میں زمینیں ہوتی ہیں۔ وہ دوران قیام اپنی زمین کی حفاظت اور کاشت کاری بھی کرتے ہیں۔ ان زمینوں کی کاشت کاری کے لیے ضروری اشیاء خصوصاً کھاد (گوبر) کا زیریں علاقوں سے لے جانا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ دوسرے خاندانوں کے مال مویشی کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ انھیں دیسی کھاد یعنی گوبر حاصل ہو سکے۔

اپنے محل وقوع کے لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل یہ خطہ زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔ ان علاقوں میں گیس کا کوئی نظام موجود نہیں اور ایندھن کا واحد ذریعہ لکڑیاں ہیں۔ بالائی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے والے خاندان نالے میں قیام کے دوران لکڑیاں جمع کرتے ہیں جو عموماً سالہا سال کھانا پکانے اور خصوصاً سردیوں میں سخت موسم کا مقابلہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ گلگت بلتستان کے اکثر وادیوں میں ماہ نومبر کے بعد سخت سردی پڑتی ہے اور دسمبر، جنوری میں درجہء حرارت نقطہء انجماد سے نیچے چلا جاتا ہے۔

ہجرت کرنے والوں کو درپیش مسائل

بالائی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے والوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ بنیادی ضروریات زندگی سے محرومی ہے۔ ان علاقوں میں کسی ہسپتال اور اسکول کا تصور بھی نہیں ہے۔ جن خانہ بدوشوں کا پیشہ ہی یہ ہے کہ دوسروں کے مال مویشی چراتے ہیں اور اس کے عوض کچھ پیسے یا پھر جانور حاصل کرتے ہیں ضلع غذر میں گجر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مفلسی کے شکار ان لوگوں کے بچے تعلیم حاصل نہیں کرتے اور عموماً اپنے آبائی پیشے کو ہی اپناتے ہیں۔

بالائی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے والوں کو سخت موسم سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ سردی کی وجہ سے جلدی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہونٹ، گال اور ایڑیاں متاثر ہوتی ہیں۔ کھانے پینے کا سامان زیریں علاقوں سے لے کر جاتے ہیں۔ سرد آب و ہوا کی وجہ سے ان علاقوں میں سبزیاں اور پھل نہیں اگائے جاسکتے ہیں۔ اس لیے یہاں رہنے والے تازہ پھل اور سبزیوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے جو کہ سال میں ایک بار ہی اگائی جاتی ہیں۔ ہسپتال نہ ہونے کی وجہ سے بیماریوں میں صرف دعا پر اکتفا کیا جاتا ہے یا دیسی طریقہء علاج کا سہارا لیا جاتا ہے۔ خصوصاً حاملہ عورتوں کو شدید مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ ماضی میں اس طرح کے واقعات بھی رونما ہو چکے ہیں کہ زچگی ان دور دراز علاقوں میں ہوئی جہاں ڈاکٹر کی موجودگی کا تصور بھی نہیں۔ ان علاقوں میں عورتوں کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً انھیں ہراساں کیے جانے کے واقعات بھی رونما ہوسکتے ہیں مگر بدقسمتی سے آج تک ان محنت کشوں کے حقوق کے حوالے سے کسی نے آواز بلند نہیں کی۔

چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا؟

تحریر: جنید احمد

زیرِ نظر مضمون میں پاکستان میں گنے کی پیداوار سے جڑے کسانوں، زیرِ کاشت زمین، پیداواری لاگت اور اس فصل سے جڑی صنعتوں، ان کی تیار کردہ مصنوعات، اور ان کی برآمدات سمیت اس شعبے میں ہونے والی ترقی اور اس کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

گنا پاکستان کی ایک اہم ترین غذائی اور نقد آور فصل ہے۔ پاکستان دنیا مین گنا پیدا کرنے والا چھٹا بڑا ملک ہے۔[1] گنا زیادہ تر پنجاب اور سندھ میں کاشت کیا جاتا ہے اس کے علاوہ کے پی کے اور کچھ بلوچستان میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کا کل زرعی رقبہ 27,040,000 ہیکٹر ز ہے۔[2] جس میں گنے کا زیرکاشت رقبہ 1,171,687 ہیکٹر ز ہے۔[3]

جدول 1: پاکستان میں گنے کی کاشت اور اوسط پیداوار (2013-14)

علاقہ	زیرکاشت رقبہ (ہیکٹر ز)	فیصد	اوسط پیداوار فی ہیکٹر (ٹن)
پاکستان	1,171,687	100	57.55
پنجاب	756,750	64.6	57.75
سندھ	297,558	25.4	61.71
کے پی کے	117,379	10	45.68
بلوچستان	700	-	45

حوالہ: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن

پچھلے چند سالوں میں پاکستان میں گنے کی کاشت میں حیرت انگیز اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ 2007-08 میں 36.86 فیصد اضافہ دیکھا گیا جو کہ 2012-13 میں کم ہوا لیکن پھر بھی 2005-06 کے مقابلے کہیں زیادہ تھا (جدول 2)۔

جدول 2: گنے کی کاشت کا رجحان

سال	رقبہ (ہیکٹر ز)	فیصد
2005-06	906,980	-
2007-08	1,241,300	36.86 اضافہ
2012-13	1,128,098	9.11 کمی
2013-14	1,171,687	29.1 اضافہ

حوالہ: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن

پاکستان میں گنے کی فصل کا دورانیہ 10 سے 12 مہینوں پر مشتمل ہے جس پر فی ایکڑ پیداوار اور لاگت درج ذیل ہے۔ یہ اعداوشمار ضلع گھوٹکی سے حاصل کیے گئے ہیں۔ بیج اور زمین کی تیاری کے لیے اخراجات چار سال میں ایک دفعہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے اس مد میں آنے والے اخراجات پہلے الگ سے پیش کیے گئے ہیں۔ (جدول3a)۔ ان اخراجات کو پھر ایک سال کی بنیاد پر حاصل کرکے سالانہ اخراجات میں شامل کیا گیا ہے۔ (جدول3b)

جدول 3a: زمین کی تیاری اور بیج پر اخراجات روپے (چار سال میں ایک دفعہ)

	اخراجات (روپے)
ہل کل چار ہل، (1,200 روپے فی ہل)	4,800
لیول	1,200
بیج کا ہل	1,200
بیج۔ تین ویسے پر (تقریباً 52 من)	6,300
ڈھلی (بیج لگانے کے بعد لیول)	1,200
بیج لگانے کی مزدوری	2,000
کل اخراجات (برائے چار سال)	16,700

جدول 3b: گنے کی فصل پر فی ایکڑ کل اخراجات

فصل کی تیاری کے مراحل	اعداد	اخراجات (روپے)
زمین کی تیاری اور بیج	-	4,175
یوریا	تین بوری	5,400
ڈی اے پی	دو بوری	7,400
گوڈی	-	2,000
اسپرے	ایک بار	900
گنے کی لوڈنگ رصفائی وغیرہ	-	14,000
کٹائی	-	1,000
کل لاگت	-	34,875
بارانی زمین پر پانی کے اخراجات	بیس مرتبہ	20,000

کل اخراجات		54,875
اوسط پیداوار	700 من*180 روپے	126,000
آمدنی	ایک ایکڑ (بارانی زمین پر)	71,125
آمدنی	ایک ایکڑ (نہری زمین پر)	91,125

گنے کا کاشتکار فی ایکڑ 5,927 روپے ماہانہ آمدنی حاصل کر پاتا ہے اگر وہ بارانی زمین کا مالک ہو (جدول 3b)۔ 7,593 روپے ماہانہ کماتا ہے اگر وہ نہری زمین کا مالک ہو جو ملک میں مقرر کردہ کم سے کم ماہانہ اجرت 12,000 روپے سے آدھی ہے۔

چینی بنانے کی صنعت

قیام پاکستان کے وقت ملک میں سات شوگرملیں تھیں، پانچ مشرقی پاکستان میں اور دو مغربی پاکستان میں۔ آبادی میں اضافے اور چینی کی طلب بڑھنے کے ساتھ ساتھ 1980 تک شوگرملوں کی تعداد 35 اور 2006 میں بڑھ کر 86 ہوگئی جس کے بعد حکومت نے مزید شوگرملوں کے قیام اور پہلے سے قائم ملوں پر پیداواری صلاحیت میں اضافے پر مکمل پابندی عائد کردی۔ ملک میں اس وقت 83 شوگرملیں کام کررہی ہیں جن میں سے 44 پنجاب میں، 32 سندھ میں اور 7 خیبر پختون خواہ میں ہیں، جن کی کل پیداواری صلاحیت 7 ملین ٹن ہے۔[4] ملک میں تقریباً 1.5 ملین افراد بلواسطہ یا بلاواسطہ اس صنعت سے وابستہ ہیں۔[5]

پاکستان کی زیادہ تر شوگرملیں معروف کاروباری اور سیاسی خاندانوں کی ملکیت ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) کو پنجاب میں چینی کی صنعت پر اجارہ داری حاصل ہے۔ جماعت کے تقریباً ایک درجن رہنما بشمول نواز شریف شوگر ملوں کے مالک ہیں۔[6] شریف خاندان کا اتفاق گروپ 1996 میں خاندان کے درمیان تقسیم ہوکر چار گروپوں میں بٹ گیا تھا حبیب وقاص گروپ، شریف گروپ، الشفیع گروپ اور برادرز گروپ۔[7]

تمام صنعتی گروپ کے بارے میں معلومات ان کی ویب سائٹ سے حاصل کردہ ہیں جبکہ مخصوص اعداد وشمار کے لیے حوالہ نمبر بھی دیا گیا ہے۔

حبیب وقاص گروپ

گروپ کے چیئرمین میاں معراج دین ہیں۔ یہ گروپ تین شوگرملوں حبیب وقاص شوگرمل شیخوپورہ، عبداللہ شوگرمل اوکاڑہ اور یوسف شوگرمل شاہ پور کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ حبیب گروپ عبداللہ ڈسٹلری کا بھی مالک ہے جو مولیسس سے ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والا ایتھنول اور الکوحل تیار کرتی ہے۔اس ڈسٹلری کی پیداواری صلاحیت 125,000 لٹر یومیہ ہے۔حبیب وقاص گروپ کے اپنے فارم بھی ہیں جہاں گنا کاشت کیا جاتا ہے۔ اتفاق ٹریکٹرز سمیت یہ گروپ انجینئرنگ، کیمیکل وغیرہ کے شعبوں میں مزید چھ کمپنیوں کا مالک ہے۔[8]

شریف گروپ

گروپ کے چیئرمین میاں محمد نواز شریف جو کہ موجودہ وزیراعظم پاکستان بھی ہیں۔ اس گروپ کے پاس چار شوگرملیں ہیں جن میں چوہدری شوگرمل گوجرہ، شمیم شوگرمل فیصل آباد، حمزہ شوگرمل رحیم یار خان اور رمضان شوگرمل جھنگ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حدیبیہ پیپر مل اور چوہدری شوگرمل کے ساتھ ایک گتہ مل بھی شریف گروپ کی ملکیت ہے۔گروپ کے گنے کے فارم اور پولٹری فارم بھی ہیں۔[9]

الشفیع گروپ

گروپ کے چیئرمین میاں محمد جاوید شریف ہیں۔ یہ گروپ دو شوگرملوں اتفاق شوگرمل پاک پتن، کشمیر شوگرمل جھنگ کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ گروپ اتفاق سنز سمیت مزید تین کمپنیوں کا بھی مالک ہے۔[10]

برادرز گروپ

گروپ کے ڈائریکٹر میاں محمد اسلم بشیر ہیں۔ گروپ برادرز شوگرمل قصور کے علاوہ برادرز انجینئرنگ اور برادرز ٹیکسٹائل کا بھی مالک ہے۔[11]

یونی کول لمیٹڈ

یونی کول ڈسٹلری میرپوخاص میں واقع ہے۔ اس کمپنی میں تین شوگرملیں برابر کے حصہ دار ہیں جن میں میرپورخاص شوگرمل میرپور خاص، فاران شوگرمل حیدرآباد اور مہران شوگرمل حیدرآباد شامل ہیں۔ یونی کول مختلف معیار کا ایتھنول بناتی ہے جو سو فیصد یورپی ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔ کمپنی کی پیداواری صلاحیت 100,000 لٹر یومیہ ہے۔[12]

امین باوانی گروپ

باوانی گروپ پاکستان کا بڑا صنعتی گروپ ہے جس کے چیف ایگزیکٹو محمد امین احمد باوانی ہیں۔ گروپ فاران شوگرمل حیدرآباد، سندھ پارٹکلز بورڈ مل سمیت کئی شعبوں میں صنعتوں کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ کیونکہ فاران شوگرمل یونی کول میں بھی حصہ دار ہے اس لیے باوانی گروپ بھی یونی کول میں حصہ دار ہے۔[13]

غلام فاروق گروپ

گروپ کے چیف ایگزیکٹو اسلم فاروق ہیں۔ پاکستان کے بڑے صنعتی گروپس میں شامل ہے جو میرپورخاص شوگرمل کے علاوہ پاکستان میں الیکٹرونکس کے صنعتی آلات اور جنریٹرز بنانے والی کمپنی گریوز (Greaves) پاکستان اور چیراٹ سیمنٹ کا بھی مالک ہے۔ کیونکہ گروپ میرپورخاص شوگرمل کا مالک ہے اس لیے یہ یونی کول میں بھی حصہ دار ہے۔[14]

مہران شوگرمل

مہران شوگرمل کے چیئرمین محمد قاسم ہشام ہیں جو یونی کول کمپنی میں بھی حصہ دار ہے۔ کمپنی کے پاس 1,000 ایکڑ پر مشتمل فارم بھی ہے جہاں گنا کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کمپنی کا اپنا پانچ میگاواٹ کا بجلی گھر بھی ہے۔[15]

تھل انڈسٹریز کارپوریشن

کارپوریشن کے چیئرمین محمد شمیم خان ہیں۔ کارپوریشن لیہ شوگرمل اور سفینہ شوگرمل کی مالک ہے۔ اس کے علاوہ 15 میگاواٹ کا گنے کے پھوک سے چلنے والا بجلی گھر بھی ہے جو اضافی بجلی فروخت بھی کرتا ہے۔ کارپوریشن کی ذیلی کمپنی المعز انڈسٹریز، المعز شوگرمل ڈیرہ اسماعیل خان کی مالک ہے۔ مل کا اپنا 35 میگاواٹ کا بجلی گھر ہے جس میں مزید 15 میگاواٹ صلاحیت کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔[16]

اومنی گروپ

گروپ کے چیئرمین خواجہ انور مجید ہیں۔ یہ گروپ نو شوگرملوں کا مالک ہے جن میں نوڈیرو شوگرمل، دادو شوگرمل، کھوسکی شوگرمل، باوانی شوگرمل، چمبر شوگرمل، ٹنڈوالہیار شوگرمل، ٹھٹھہ شوگرمل، لاڑ شوگرمل اور انصاری شوگرمل شامل ہیں۔[17]

جمال دین والی (JDW) گروپ

یہ گروپ تین شوگر ملوں کا مالک ہے۔ یونٹ I رحیم یار خان، یونٹ II صادق آباد اور یونٹ III گھوٹکی میں واقع ہیں جس کے ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹو جہانگیر خان ترین ہیں جو پاکستان تحریک انصاف کے مرکزی سیکرٹری جنرل بھی ہیں جبکہ گروپ کے چیئرمین اور ڈائریکٹر پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے رہنما، سابق گورنر پنجاب اور سابق وزیر اعظم پاکستان یوسف رضا گیلانی کے رشتہ دار سید احمد محمود ہیں۔ JDW (جے ڈی ڈبلیو) کی تینوں شوگرملوں سے حاصل کردہ پیداوار کل ملکی پیداور کا 15 سے 17 فیصد ہے۔

کمپنی کے یونٹ II صادق آباد اور یونٹ III گھوٹکی میں بالترتیب 26.6 اور 26.8 میگاواٹ گنے کے پھوک (bagasse) سے چلنے والے بجلی گھر ہیں جو قومی گرڈ کو بجلی فروخت بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گروپ پاکستان میں جدید کارپوریٹ فارمنگ کے طریقوں پر عمل پیرا ہے، جدید زرعی آلات کی بدولت کمپنی کے پاس ہر سال 12,000 ایکڑ پر 400,000 ٹن گنا کاشت کرنے کی صلاحیت ہے۔ کمپنی کے ساتھ غیرملکی ماہرین گنے پر تحقیق اور زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے کام کررہے ہیں۔[18]

حبیب گروپ

پاکستان کا بڑا صنعتی تجارتی گروپ ہے جس کے ڈائریکٹر علی رضا داؤد حبیب و دیگر شامل ہیں اور حبیب شوگرمل نوابشاہ کا مالک ہے اور چینی کے علاوہ ایتھنول بھی تیار کرتا ہے۔ کیماڑی کی بندرگاہ پر کمپنی کے بڑے پیمانے پر محلول ذخیرہ کرنے والے ٹینک (بلک اسٹوریج ٹینک) بھی ہیں جو مولیسس اور ایتھنول کی برآمد اور دیگر درآمدات کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔[19]

ٹھنڈیانوالہ گروپ

گروپ چیئرمین اکبر خان ہیں۔ ٹھنڈیانوالہ شوگرمل یونٹ I فیصل آباد، ٹھنڈیانوالہ شوگرمل یونٹ II مظفرگڑھ، ٹھنڈیانوالہ شوگرمل یونٹ III ڈیرہ اسماعیل خان کا مالک ہے۔ فیصل آباد میں ڈسٹلری یونٹ بھی ہے۔ ٹوپ گیس (CO_2) ٹھنڈیانوالہ گروپ کی ہیں۔[20]

اس کے علاوہ بدین کی مرزا شوگرمل[21] اور پنگریو شوگرمل[22] کے ڈائریکٹرز میں پیپلز پارٹی کے رہنماء ذوالفقار مرزا اور ان کا خاندان شامل ہے۔

چینی کی پیداوار

پاکستان میں گنے کی پیداوار میں ہونے والے اضافے سے چینی کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ پاکستان چینی پیدا کرنے اور استعمال کرنے والا آٹھواں اور چینی برآمد کرنے والا ساتواں بڑا ملک ہے۔[23] یہ واضح ہے کہ 2005-06 سے 2007-08 تک چینی کی پیداوار میں 80 فیصد سے بھی زیادہ اضافہ ہوا (جدول5)۔

جدول 5: چینی کی پیداوار اور برآمدات

سال	پیداوار (ٹن)	اضافہ (فیصد)	برآمد (ٹن)	اضافہ (فیصد)
2005-6	2,588,177	-	61047	-
2007-8	4,740,913	83.17	260,840	327.27

2012-13	5,030,129	6.1	1,064,215	308
2013-14	5,587,568	11	647,333	39 (کمی)

حوالہ: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن

گنے سے چینی بنانے کے عمل کے دوران ضمنی پیداوار یا بائے پراڈکٹس میں مولیسس اور گنے کا پھوک بھی حاصل ہوتا ہے جو ایتھنول بنانے، کئی طرح کی غذائی مصنوعات، جانوروں کے چارے، کھاد، ایندھن کے طور پر اور کاغذ، گتا، چپ بورڈ بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

گنے کا پھوک

گنے سے چینی بنانے کے لیے اس کا رس حاصل کر لینے کے بعد گنے کا پھوک بچ جاتا ہے جسے خشک کرکے بجلی بنانے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے کاغذ، گتا اور چپ بورڈ بھی بنایا جاتا ہے۔ پاکستان میں گنے کی کرشنگ کے بعد تقریباً 10 ملین ٹن گنے کا پھوک پیدا ہوتا ہے جس سے حکومت 3,000 میگاواٹ بجلی حاصل کرنے کا منصوبہ بنارہی ہے۔ خیال ہے اس سے نہ صرف فرنس آئل کی درآمد میں کمی آئے گی بلکہ درآمدی بل میں بھی 33 سے 49 بلین روپے سالانہ بچت ہوگی۔ شوگر ملیں اسی بجلی کو استعمال کرتی ہیں اور کچھ ملیں زائد بجلی نیشنل الیکٹرک پاور ریگولیٹری اتھارٹی کو فروخت بھی کرتی ہیں۔[24]

مولیسس

مولیسس گنے سے چینی کی پیداوار کے دوران حاصل ہوتا ہے۔ گنے سے حاصل ہونے والی چینی کی پیداوار کا 40 فیصد حصہ مولیسس حاصل ہوتا ہے۔[25] مولیسس کا استعمال غذائی مصنوعات اور دیگر صنعتوں میں عام ہے۔ اس کے علاوہ مولیسس الکوحل یا ایتھنول بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان دنیا میں مولیسس برآمد کرنے والے تین بڑے ممالک میں سے ایک ہے۔[26] پاکستان سے مولیسس کے خریدار ممالک میں چین، ترکی، امریکہ، سعودی عرب، برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ سمیت کئی ممالک شامل ہیں اور توقع ہے کہ آنے والوں سالوں میں مولیسس کی برآمدات 300,000 ٹن سے تجاوز کر جائیں گی۔[27] یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ گوکہ مولیسس کی پیداوار مستقل بڑھ رہی ہے اس کی برآمد میں واضح کمی نظر آرہی ہے (جدول 6)۔

جدول 6: مولیسس کی پیداوار اور برآمدات

سال	پیداوار (ٹن)	اضافہ (فیصد)	برآمد (ٹن)	(فیصد)
2005-6	1,437,954		497,161	
2007-8	2,663,708	85.2	780,807	57 اضافہ
2012-13	2,252,751	15	225,221	71.15 کمی
2013-14	2,524,202	12	197,34	91.23 کمی

حوالہ: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن

ایتھنول

ایتھنول مولیسس سے تیار کیا جاتا ہے جو مشروبات کی تیاری، دواسازی، رنگ سازی، کاسمیٹکس کی مصنوعات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ سالوں سے ایتھنول کا ایک نیا استعمال متعارف کرایا گیا ہے یعنی بطور متبادل ایندھن جس کے بارے میں اب یہ خیال عام ہے کہ وہ تیل، کوئلہ اور گیس کے مقابلے ماحول دوست خصوصیات رکھتا ہے۔ پاکستان مولیسس سے تیار کردہ ایتھنول برآمد کرنے والے بڑے ممالک میں شامل ہے۔ اس وقت پاکستان میں مولیسس سے ایتھنول بنانے والی 15 ڈسٹلریز (distilleries) کام کررہی ہیں جن کی مجموعی پیداواری صلاحیت 400,000 لاکھ ٹن سالانہ ہے جو اعلیٰ معیار کا ایتھنول یا الکوحل تیار کررہی ہیں۔[28] تقریباً تمام ڈسٹلریز شوگر ملوں کے ساتھ ہی قائم ہیں اور شوگر ملوں کی ہی ملکیت ہیں۔ ملک میں تیار ہونے والا زیادہ تر ایتھنول برآمد کیا جاتا ہے جو مشروبات اور دیگر صنعتوں میں استعمال کے ساتھ ساتھ متبادل ایندھن کے طور پر بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ قابل غور ہے کہ 2007-08 کے بعد ایتھنول کی برآمد کافی تیزی سے بڑھی ہے (جدول 7)۔

جدول 7: ایتھنول کی پیداوار اور برآمدات

سال	برآمد (ٹن) فیصد	فیصد
2005-6	26659.94	
2007-8	22573.15	15.32 کمی
2012-13	112089.62	400 اضافہ
2013-14	388564.19	246.65 اضافہ

حوالہ: پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن

اب تک گنے کی فصل سے حاصل ہونے والی پیداوار اور صنعتوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔ گوکہ اس صنعت سے حاصل ہونے والے منافع کے کوئی مصدقہ اعداد وشمار حاصل نہیں ہوسکے لیکن کچھ اعداد وشمار قارئین کے لیے پیش کیے جارہے ہیں جس میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا شوگر ملیں کسانوں کو 182 روپے فی من گنے کی قیمت دے کر اور ملکی منڈی میں چینی 50 روپے فی کلو فروخت کرکے پیداواری نقصان کا شکار ہیں؟

جدول 8: گنے سے حاصل شدہ پیداوار کی مالیت اور منافع

نام	کل پیداوار (ٹن)	قیمت (روپے فی ٹن)	کل مالیت (بلین روپے)
چینی	5,587,568❖	45,758	255.82
مولیسس	2,524,202◆	12,721	32.1
پھوک	1,000,000*	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں
حاصل شدہ مصنوعات	-	-	287.9
گنا**	-	-	254
قبل از ٹیکس آمدنی تقریباً	-	-	33.9+ گنے کا پھوک

نوٹ: جدول 8 میں حاصل کردہ معلومات کے ذرائع اسی مضمون کے جدول اور حوالہ جات سے لیے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

❖ جدول5؛ ◆ جدول6؛ * حوالہ نمبر24؛ ** حوالہ نمبر1۔

درج بالا جدول8 کے مطابق سال 2013-14 میں شوگرملوں نے مجموعی طور پر 254 بلین روپے کا گنا خریدا جس سے 287.9 بلین روپے مالیت کی مصنوعات چینی اور مولیس تیار کیا گیا یعنی قبل از پیداواری اخراجات اور ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر اس صنعت نے 33.9 بلین روپے اور دس لاکھ ٹن گنے کے پھوک کی صورت میں آمدنی حاصل کی۔

تبصرہ

اوپر پیش کی گئی تفصیلات کے مطابق پاکستان میں 2005-6 سے 2013-14 تک گنے کے زیر کاشت رقبے میں 29.1 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ گنے کی کاشت کے لیے گندم کے مقابلے کہیں زیادہ پانی درکار ہوتا ہے گندم کی فصل کو بوائی سے لے کر کٹائی تک زیادہ سے زیادہ تین سے چار بار پانی دیا جاتا ہے جبکہ گنے کی فصل کو بیس بار پانی دینا پڑتا ہے۔ پاکستان میں خاص کر صوبہ سندھ میں جہاں پانی کی کمی ہے گنے کے زیر کاشت رقبے میں اضافہ غذائی عدم تحفظ میں اضافے کے مترادف ہے کیونکہ کم پانی کے استعمال سے گندم کی پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے جس سے بھوک میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ سندھ حکومت بجائے اس کے کہ صوبے بھر میں گندم کے زیرکاشت رقبے میں اضافے کے لیے اقدامات کرتی اور گنے کے زیر کاشت رقبے میں اضافے کی حوصلہ شکنی کرتی حکومت سندھ نے چاول جیسی اہم غذائی فصل کی کاشت پر پابندی عائد کردی کیونکہ چاول کی کاشت کے لیے بھی زیادہ پانی درکار ہوتا ہے۔ اس پابندی کے نتیجے میں صوبے میں گنے کی پیداوار اور زیرکاشت رقبے میں واضح اضافہ ہوا جس سے ملک میں چینی اور گنے سے حاصل ہونے والی دیگر مصنوعات کی پیداوار اور برآمدات میں اضافہ ہوا جس کا براہ راست فائدہ مل مالکان نے اٹھایا۔

خصوصاً سندھ میں اور مجموعی طور پر پورے ملک میں گنے کی پیدوار میں اضافے کے نتیجے میں چاول کے زیرکاشت رقبے اور پیداوار میں کمی واقع ہوئی چاول کا زیرکاشت رقبہ جو 2008-9 میں 2,963,000 ہیکٹرز تھا جو کہ 2012-13 تک بتدریج کم ہوکر 2,311,000 ہیکٹرز ہوگیا یعنی چاول کی کاشت میں 22 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔29

پاکستان میں چینی کی طلب سے کہیں زیادہ چینی کی پیداوار کا رجحان عالمی منڈیوں میں بڑھتی ہوئی متبادل ایندھن کی طلب کی وجہ سے جاری ہے۔ 2007-8 میں دنیا بھر میں غذائی قیمتوں میں اضافہ ہوا اور تیل کی عالمی قیمت میں اضافے کی وجہ سے دنیا بھر میں متبادل توانائی (جسے اب عام طور پر ایگرو فیول کہا جاتا ہے) کی طلب میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ گنا ایگرو فیول کے حصول کا بہترین زریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں بھی گنے کی پیداوار اور زیرکاشت رقبے میں اضافہ ہوا۔ پاکستان میں 2007-8 میں گنے کے زیرکاشت رقبے میں صرف دوسالوں میں تقریباً 37 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا اور ایتھنول کی برآمد میں 2004 کے مقابلے 125 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا۔

پاکستان میں چینی کی طلب سالانہ 4,512,000 ٹن ہے جبکہ پیداوار 5,587,568 ٹن ہوچکی ہے۔ پاکستان ہر سال تقریباً گیارہ لاکھ ٹن ضرورت سے زائد چینی پیدا کررہا ہے۔ صوبائی حکومتیں صوبے میں گنے کی پیداوار کا ہدف مقرر کرتے وقت ملوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں کیونکہ ملوں کی زیادہ سے زیادہ چینی کی پیداوار سے مولیسس اور ایتھنول کی زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے جس کی طلب بھی زیادہ ہے اور اس کی برآمد منافع بخش بھی۔ مولیسس تیار (پراسیس) کرنے کے لیے سندھ اور پنجاب کی تقریبا تمام بڑی شوگرملوں نے ڈسٹلریز قائم کررکھی ہیں جو ایتھنول تیار کررہی ہیں اور لگاتار ان کی برآمدات میں اضافہ بھی ہورہا ہے۔ اوپر دیے گئے اعدادوشمار سے واضح ہے کہ مولیسس کی برآمدات میں کمی واقع ہوئی جس کی وجہ بڑے پیمانے پر ایتھنول بنانے کی ڈسٹلریز کا قیام اور اس کے نتیجے میں ایتھنول کی برآمدات میں اضافہ ہوا۔

سندھ میں پچھلے تین سالوں سے گنے کی بوائی کا ہدف 247,000 ہیکٹرز تھا جسے سندھ حکومت نے سال 2014-15 کے لیے بڑھا کر 272,000 کردیا یعنی تقریباً 62,000 ایکڑ زمین مزید گنے کی کاشت کے لیے مقرر کردی گئی۔30 اس حکومتی اقدام سے صوبے میں قائم شوگر ملوں کو جو زیادہ تر حکومتی جماعت سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کی ہیں، فائدہ پہنچا۔

پاکستان میں شوگر ملوں کے لائسنس بغیر کسی تحقیق اور جائزے کے جاری کیے جاتے رہے کہ آیا ملک میں مزید شوگرملوں کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ صرف جنرل پرویز مشرف کے دور میں ہی 30 نئ شوگرملوں کے لائسنس جاری کیے گئے

حالانکہ ملکی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس وقت بھی پچاس سے زیادہ شوگرملیں موجود تھیں جو موجودہ ضروریات کے لیے بھی کافی تھیں۔31

پاکستان میں شوگر ملوں کے زیادہ تر مالکان جو قومی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، ہمیشہ حکومت اور حزب اختلاف دونوں میں ہی موجود ہوتے ہیں اور اس صنعت سے متعلق قوانین اور حکمت عملی پر براہ راست اپنے منافع میں اضافے اور مراعات کے حصول کے لیے اثرانداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 2006 میں پیدا ہونے والے چینی کے بحران پر قومی احتساب بیورو نے سپریم کورٹ میں اپنی پیش کردہ رپورٹ میں واضح طور پر کہا تھا کہ چینی کی صنعت پر آصف علی زرداری، نواز شریف، شہباز شریف، چوہدری شجاعت حسین، جہانگیر ترین، میاں اظہر، انور چیمہ، نصراللہ دریشک، ہارون اختر اور میاں الطاف سلیم سمیت دیگر سیاستدانوں کی اجارہ داری ہے جو چینی کی ذخیرہ اندوزی کرکے بحران پیدا کررہے ہیں۔32

اسی طرح کمپٹیشن کمیشن آف پاکستان (CCP) نے بھی اپنی رپورٹوں میں چینی کی صنعت میں مبینہ طور پر ناجائز منافع خوری کے لیے ملی بھگت کی نشاندہی کی تھی۔ ان رپورٹوں پر کاروائی کے بجائے پچھلی حکومت نے چیئرمین CCP (سی سی پی) کو برطرف کرکے پارلیمنٹ کے ذریعے سی سی پی کے قوانین میں تبدیلی کردی جس کے تحت شوگر ملوں کو ہائیکورٹ میں اپیل کا حق دے دیا گیا۔ اس طرح ہوشیاری سے کمیشن کے اقدامات کو قانونی طوالت کے ذریعے غیر موثر کردیا گیا۔33

ملک میں اس طرز عمل کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حال ہی میں حکومت کی جانب سے چینی کی برآمد پر دس روپے فی کلو زرتلافی کی فراہمی کا اعلان قابل ذکر ہے۔34 اب تک پاکستان میں چینی پر دی جانے والی زرتلافی کی یہ بلند ترین شرح ہے۔ حکومت ملکی چینی کے ذخائر برآمد کرنے کے لیے زرتلافی دیتی ہے اور درآمد پر بھاری محصول عائد کرتی ہے جس سے براہ راست فائدہ مل مالکان اٹھاتے ہیں۔ کسان جو مسلسل مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے پیداواری لاگت میں اضافے کے سبب متاثر ہورہے ہیں انہیں زرتلافی فراہم نہیں کیا جارہا ہے۔ 2005 سے اب تک یوریا اور ڈی اے پی کی قیمتوں کا جائزہ لیا جائے تو ڈی اے پی قیمت میں 648 فیصد اور یوریا کی قیمت میں 363.78 فیصد اضافہ ہوا جبکہ ڈیزل کی قیمت میں 2006 سے اب تک 114.36 فیصد اضافہ ہوچکا ہے۔35

چینی کے پیداواری عمل کے تجزیے سے ملک کے طبقاتی نظام میں موجود استحصال اور ظلم واضح نظر آتا ہے۔ ایک طرف مل مالکان ہیں جن کے نہ صرف کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا بلکہ ان کی زرعی زمینیں بھی اب جدید طریقہ زراعت کے تحت انہیں خام مال مہیا کررہی ہیں جس سے اس سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کی ملکی معیشت پر گرفت مزید مظبوط ہو رہی ہے۔ دوسری طرف اس ہی صنعت سے وابسطہ مل مزدور اور کھیت مزدور ملک بھر میں صحت، تعلیم جیسی سہولیات تو دور پیٹ بھر روٹی سے بھی محروم ہوتے جارہے ہیں۔

2005 سے اب تک ملوں کی تعداد، گنے کی پیداوار، چینی اور دیگر مصنوعات کی برآمد اور مل مالکان کی دولت میں تو اضافہ ہوا لیکن چھوٹے اور بے زمین کسان اور مزدوروں کی حالت آج پہلے بھی زیادہ بدتر ہے۔ چھوٹے کاشتکار اور وہ زرعی مزدور جو گنا اگانے سے لیکر اس کی کٹائی اور ملوں تک لے جانے کا کام سرانجام دیتے ہیں اسی کسمپرسی کے عالم میں ہیں جہاں وہ 2005 میں تھے۔ اوپر دیے گئے جدول 4 کے مطابق چھوٹا کاشتکار دس سے بارہ مہینوں پر مشتمل گنے کی فصل پر فی ایکڑ آٹھ ہزار روپے مہینہ بھی نہیں کما پاتا۔ کسان کی محنت کا استحصال اور ناانصافی کا مظاہرہ صوبہ سندھ میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں شوگر ملوں نے کسانوں سے مقرر کردہ امدادی قیمت 182 روپے فی من پر گنا خریدنے سے انکار کر دیا اور کرشنگ روک دی جو سراسر ہٹ دھرمی اور غیر قانونی عمل ہے کیونکہ مل گنے کی کرشنگ روکنے کا اختیار نہیں رکھتے ایسی صورت میں حکومت کے پاس اختیار ہے کہ وہ مل اپنی تحویل میں لے کر کرشنگ کا آغاز کرے لیکن حکومت سندھ نے جس میں شامل رہنماء خود شوگر ملوں کے مالک ہیں، اس سارے معاملے میں تماشائی کا کردار ادا کیا۔36 ماسوائے چند ملوں کے سندھ کی تمام ملوں نے کاشتکاروں سے گنا 150 سے 155 روپے فی من خریدا جبکہ پچھلے سال سندھ میں گنے کی امدادی قیمت 172 روپے فی من تھی۔37 سندھ میں کاشتکاروں کو کم قیمت پر گنا بیچنے پر مجبور کردیا گیا۔ کاشتکاروں کے صوبے بھر میں احتجاج اور ہائی کورٹ کے فیصلوں کے باوجود مقررہ قیمت پر عملدرآمد کرانے کی کوئی کوشش سرکار نے سرے سے کی ہی نہیں۔

اگر گنے کی پیداوار سے جڑے زرعی مزدوروں کی صورتحال پر نظر ڈالیں تو ان کے حالات مزید پریشان کن ہیں۔ آج بھی مزدوروں کو گنے کی کٹائی اور اسے ٹرالیوں پر لادنے کی اجرت 20 روپے فی من دی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ پر گنے کی کٹائی اگر سات مزدور کرتے ہیں تو چھ دن میں کٹائی اور ٹرالیوں پر لادنے کا کام مکمل ہوتا ہے یعنی اوسط پیداوار 700 من فی ایکڑ کے حساب سے مزدوروں کی یومیہ اجرت 333 روپے بنتی ہے۔ گنے کے زیرکاشت علاقوں خاص کر بدین، سانگھڑ، ٹھٹھہ، گھوٹکی، رحیم یار خان، صادق آباد میں گنے کی پیداوار سے وابستہ کسان مزدوروں کی حالت دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس صنعت سے کون سا طبقہ منافع کما رہا ہے اور کون پیٹ بھر روٹی سے بھی محروم ہے۔ ہر حکومت چاہے وہ فوجی ہو یا جمہوری، میں شامل بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اپنے مفاد میں قانون سازی کی اور سرکاری سرپرستی میں کسان مزدور طبقے کا استحصال کیا۔ کسان کو اس کے زمین کے حق سے محروم رکھ کر غربت بھوک اور محتاجی کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کسانوں کی خودمختاری اور غذائی تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف زمین اس کی اپنی ہو بلکہ اس کی پیداوار کو بھی تحفظ حاصل ہوتا کہ کسان اپنی محنت کا جائز معاوضہ حاصل کرسکیں۔

پاکستان میں اور عالمی منڈی میں چینی کی کم قیمت کو بنیاد بنا کر حکومت کی طرف سے زرتلافی حاصل کرنا اور کسانوں کو ان کی جائز آمدنی سے محروم کرنا پاکستانی

عوام بلخصوص گنے کے کاشتکاروں کے ساتھ سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔ اگر ملوں کو چینی برآمد کرنے میں نقصان ہورہا ہے تو مل اضافی پیداوار نہ کریں جس سے گنے کے زیر کاشت رقبے میں کمی بھی آئیگی اور غذائی فصلوں کی کاشت میں اضافہ ہوگا جس سے بہرحال کسان اپنا پیٹ بھرسکتے ہیں اور کم از کم ملک کو گندم درآمد نہیں کرنی پڑے گی اور سب سے بڑھ کر ملکی خزانے سے اربوں روپے چینی کی برآمد پر بطور زرتلافی نہیں دینے پڑیں گے۔38 اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ صنعتکار زیادہ پیداوار فروخت کرنے اور منافع حاصل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے زرتلافی کے حقدار ہیں تو کسانوں کے ساتھ بھی یہ حکمت عملی اپنائی جائے جبکہ کسانوں کی پیداواری لاگت سے حکومت بخوبی آگاہ ہے۔

گوکہ کسان کی گنے کی پیداوار میں لاگت واضع ہے مگر شوگر مل مالکان پیداواری لاگت میں اضافے کی شکایت تو کرتے ہیں لیکن اس نقصان کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اعدادوشمار پیش نہیں کرتے۔ کیا گنے سے چینی حاصل کرنے کے بعد اس سے حاصل ہونے والی دیگر مصنوعات کی قدر پیداواری لاگت سے منہا کی جاتی ہے؟ پاکستان سے مولیسس اور ایتھنول کی برآمدات مسلسل بڑھتی جارہی ہیں، پاکستان کی زیادہ تر بڑی شوگر ملیں بشمول مہران شوگر مل، حسیب وقاص شوگر مل، میرپورخاص شوگر مل، عبداللہ شوگر مل ڈسٹلریز کی بھی مالک ہیں جو 80 فیصد سے زیادہ پیداوار جس میں اعلی معیار کا ایتھنول بھی شامل ہے، برآمد کررہی ہیں۔

پاکستان میں شوگر ملوں نے نہ صرف اپنی چینی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کیا ہے بلکہ ضمنی پیداوار سے بھی بھرپور منافع کمارہی ہیں۔ جدول 8 کے مطابق شوگر ملیں کسی صورت نقصان کا شکار نہیں ہیں جبکہ اس میں مولیسس سے تیار کئے گئے ایتھنول کی صنعت سے حاصل آمدنی اور ضمنی پیداوار میں حاصل ہونے والا گنے کا پھوک شامل نہیں جس سے تقریباً تمام شوگر ملیں اپنی توانائی کی ضروریات کو پورا کر کررہی ہیں اور سات شوگر ملیں زائد بجلی قومی گرڈ کو فروخت بھی کررہی ہیں جن میں لیہ شوگر ملز، حمزہ شوگر مل، النور شوگر مل، رحیم یار خان شوگر مل، المعیز شوگر مل اور جے ڈی ڈبلیو شوگر ملیں شامل ہیں۔ صرف اکتوبر 2014 میں ہی نیپرا نے 24 شوگر ملوں کو بجلی بنانے اور اسے قومی گرڈ کو فروخت کرنے کے لیے لائسنس جاری کیے اور 10.50 روپے فی یونٹ نرخ بھی مقرر کیے38۔ گنے کا پھوک صرف بجلی ہی نہیں کاغذ، گتا اور چپ بورڈ کی صنعت میں بھی بطور خام مال استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کچھ صنعتی گروپ شوگر مل کے ساتھ ساتھ کاغذ، گتہ مل اور چپ بورڈ مل کے بھی مالک ہیں مثلاً اتفاق شوگر مل حدیبیہ پیپر ملز کا مالک ہے اور حسیب وقاص گروپ شوگر مل کے ساتھ گتہ مل اور امین باوانی گروپ سندھ پارٹیکلز بورڈ مل کا بھی مالک ہے۔

پاکستان میں گنے سے تیار مصنوعات کی صنعت سال بہ سال ترقی کی جانب گامزن ہے ایسے میں مل مالکان کی جانب سے پیداواری نقصان ظاہر کرکے کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کرنا سراسر ظلم و ناانصافی ہے جس کا ازالہ بدقسمتی سے شاید حکومت بھی نہ کرسکے کیونکہ حکومت اور حزب اختلاف خود ان ملوں کے مالکان ہیں یا گنے کے بڑے زمیندار۔ ایسی صورتحال میں ان کسان مزدوروں خاص کر سندھ کے کسان جنہیں سرکاری نرخ سے کہیں کم قیمت پر گنا فروخت کرنے پر مجبور کردیا گیا، کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا تو وہ اپنا زریعہ معاش تبدیل کرلیں یا پھر ان ظالم سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف متحد ہوکر صف آرا ہو جائیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔

حوالہ جات

1. Pakistan Sugar Mills Association, Management. "Annual Report, 2014." Pakistan Sugar Mills Association, 2014, p. 41. Accessed from http://www.psmacentre.com/documents/annual-report-2014.pdf
2. Food and Agriculture Organization of the United Nations (FAO). "Pakistan key statistics: agricultural area." FAO, 2015. Accessed from http://www.fao.org/countryprofiles/index/en/?iso3=PAK
3. Pakistan Sugar Mills Association. "Statistics National: Table 1 sugarcane plantation area, production yield, and utilization of sugarcane by sugar mills." Pakistan Sugar Mills Association, Year? Accessed from http://www.psmacentre.com/statistics.php?stid=1&type=national&status=1&link=15
4. Gillani, Waqar. "Political impact." The News, January 11, 2015. Accessed from http://tns.thenews.com.pk/political-impact-on-the-sugar-industry/
5. Saeed, Kamran, Research and Development Department, Lahore Chamber of Commerce, "Overview of sugar industry in Pakistan." The Lahore Chamber of Commerce and Industry, June 2013, p. 3. Accessed from http://www.lcci.com.pk/rnd_reports/Sugar%20Sector%20%28LCCI%29.pdf
6. Gillani, Waqar. "Political impact." The News, 11 January, 2015.
7. Shahid-ur-Rehman. "Who owns Pakistan." Shahid-ur-Rehman, 1998, p. 136.
8. Haseeb Waqas Group. "Haseeb Waqas Group." Haseeb Waqas Group and Companies, 2006. Accessed from http://www.hwgc.com.pk/corporate_profile.htm
9. Sharif Group. "Sharif Group." Sharif Group, 2010. Accessed from http://www.sharifgroupn.com/en/
10. Al-Shafi Group of Companies. "Al-Shafi Group of Companies." Al-Shafi Group of Companies, 2013. Accessed from http://www.alshafigroup.com/about-us.php
11. Brothers Textile Mills Limited. "Brothers Textile Mills Limited." Brothers Group, 2012. Accessed from http://www.brothersgrouppk.com/index.php
12. Unicol Limited. "UNICOL." Unicol, Ltd, 2009-10. Accessed from http://www.unicol.com.pk/index.html
13. Amin Bawany Group. "Amin Bawany Group." Amin Bawany Group, 2015. Accessed from http://bawany.com.pk/#industries
14. Gulam Faruque Group. "Gulam Faruque Group." Gulam Faruque Group, 2014. Accessed from http://gfg.com.pk/page.php?page=4&cat=1111

26. Unicol Limited. "UNICOL." 2009-10, Unicol, Ltd.
27. Aazim, Mohiuddin. "Rising Output and Export of Molasses." DAWN, August 1, 2013. Accessed from http://www.dawn.com/news/1032579
28. Unicol Limited. "UNICOL." 2009-10, Unicol, Ltd.
29. Memon, Dr. Noor A. "Rice: important cash crop of Pakistan." Pakistan Food Journal, September-October, 2013, p. 21. Accessed from http://www.foodjournal.pk/Sept-Oct-2013/Sept-Oct-2013-PDF/Editors-note.pdf
30. Hussain Khan, Mohammad. "Sugarcane sowing target." DAWN, September 1, 2014. Accessed from http://www.dawn.com/news/1129095
31. Sahi, Aoun. "There is no sugar policy in the country." The News, January 11, 2015. Accessed from http://tns.thenews.com.pk/no-sugar-policy-in-pakistan/#.VUyeE_mqpHw
32. Gillani, Waqar. "Political impact." The News, 11 January, 2015.
33. Sahi, Aoun. "The losers are farmers and consumers." The News, January 11, 2015. Accessed from http://tns.thenews.com.pk/sugar-industry-the-losers-are-farmers-and-consumers/#.VUyfjPmqpHw
34. Hussain Khan, Mohammad. "Disputed sugarcane support price." DAWN, January 6, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1154984
35. Index Mundi. "Urea monthly prices, Pakistan Rupee per metric ton." 2014. Index Mundi. Accessed from http://www.indexmundi.com/commodities/?commodity=urea
36. Siddique, Salman. "Sugar mills in Sindh to resume production amid pricing dispute." The News, January 10, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/Todays-News-3-295045-Sugar-mills-in-Sindh-to-resume-production-amid-pricing-dispute
37. Pakistan Sugar Mills Association, Management. "Annual Report, 2014." Pakistan Sugar Mills Association, 2014, p. 23. Accessed from http://www.psmacentre.com/documents/annual-report-2014.pdf
38. Bokhari, Ashfak. "Cheaper wheat imports." DAWN, August 25, 2014. Accessed from http://www.dawn.com/news/1127476

http://gfg.com.pk/page.php?page=4&cat=1111
15. Mehran Sugar Mills Limited. "Mehran Sugar Mills Limited." Mehran Sugar Mills Limited, 2011-12. Accessed from http://mehransugar.com/index.php
16. Thal Industries Corporation Limited. "Thal Industries Corporation Limited." Thal Industries, 2014. Accessed from http://www.thalindustries.com/index.html
17. Omni Group. "Omni Group." Omni Group, 2015. Accessed from http://omnigroup.com.pk/en//
18. JDW Group. "JDW Group." JDW Group, 2015. Accessed from http://www.jdw-group.com/
19. Habib Sugar Mills Ltd. "Habib Sugar Mills Ltd." Habib Sugar Mills Ltd, 2015. Accessed from http://www.habib.com/sugar/
20. TSML Group. "Thandlianwala Sugar Mills Ltd." Thandlianwala Sugar Mills Ltd, 2012. Accessed from http://www.tsmlgroup.com/
21. Mirza Sugar Mills Limited. "Mirza Sugar Mills Limited." Mirza Sugar Mills Limited. 2015. Accessed from http://www.mirzasugar.com/Company_Profile.html
22. Pangrio Sugar Mills Limited. "Pangrio Sugar Mills Limited." Pangrio Sugar Mills Limited, 2015. Accessed from http://www.pangriosugar.com/Company_Profile.html
23. Pakistan Sugar Mills Association. "Annual Report 2014." p. 41, 42. Accessed from http://www.psmacentre.com/documents/annual-report-2014.pdf
24. Mirza, Javed. "NEPRA grants 90 MW power generation licenses." The News, March 24, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/Todays-News-3-308513-NEPRA-grants-90MW-power-generation-licences
25. Mena, A. "The utilization of sugarcane by-products as substitutes for cereal in animal feed," in Sansousy, R, Preston, T. R. and Leng, R. A. (Eds). "Proceedings of the FAO expert consultation on the substitution of imported concentrate feeds in animal production systems in developing countries." Animal Production and Health Paper 63, Food and Agriculture Organization of the United Nations (FAO), Bangkok, 9-13 September, 1987. Accessed from http://www.fao.org/docrep/003/x6930e/X6930E00.htm#TOC

بقیہ حوالہ جات: عالمی زمینی قبضے

23. PANAP. "Three reasons why the 'rai Principles' undermine the right to food, land and resources." November 6, 2014. Accessed from http://farmlandgrab.org/post/view/24227-three-reasons-why-the-rai-principles-undermine-the-right-to-food-land-and-resources
24. PANAP. "29 March, 'day of the landless,' stop land grabbing! defend human rights!" March 29, 2015. Accessed from http://www.farmlandgrab.org/post/view/24712-29-march-day-of-the-landless-stop-land-grabbing-defend-human-rights
25۔ ''29 مارچ، کو بے زمینوں کا دن منانے کا فیصلہ۔'' روزنامہ ایکسپریس، ملتان، 30 مارچ، 2015۔

عالمی زمینی قبضے

تحریر: مصطفیٰ عقیل

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے قیام سے قبل ممالک کے درمیان زرعی تجارت باہمی تعلقات کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ اس تجارت کے لیے کسی باقاعدہ ادارے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی بلکہ اسے ہر ملک کا داخلی مسئلہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ زراعت دنیا میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے لیے خوراک کے حصول اور روزگار کا ذریعہ ہے۔ مگر 1995 میں ڈبلیو ٹی او کے وجود میں آتے ہی انسانی زندگی سے وابستہ انتہائی اہم نوعیت کے شعبوں کو تجارت کے زمرے میں ڈال کر منافع کمانے کے نت نئے ہتھیار، طریقے اور ہتھکنڈے ایجاد کیے گئے، اس طرح زراعت کو بھی اس دائرے میں شامل کرلیا گیا۔

ڈبلیو ٹی او کے دیگر معاہدوں کی طرح، عالمی زرعی معاہدہ (اے او اے) بھی سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والے بین الاقوامی کمپنیوں سے وابستہ افراد نے مرتب کیا ہے۔ یہ زرعی معاہدہ دراصل سرمایہ دارانہ ممالک کے لیے ایک ڈھال اور غریب زرعی ممالک کے لیے زراعت کے شعبہ میں خودکفیل ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ وہ ممالک جو پہلے خوراک کے شعبے میں خودکفیل تھے، اس معاہدے پر عمل درآمد سے اب اپنی غذائی ضروریات کے حصول کے لیے بھی محتاج ہوگئے ہیں۔ اس آزاد تجارت کی فضا میں بین الاقوامی کمپنیاں تیزی سے تیسری دنیا کے ممالک میں ٹھیکے پر یا خرید کر بڑے بڑے زمینی رقبے پر قبضہ کررہی ہیں۔ زمینی قبضہ جسے انگریزی میں لینڈ گریبنگ (land grabbing) کہا جاتا ہے، کو اگر عوامی تناظر میں دیکھا جائے تو کئی عوام دشمن، کسان دشمن نکات پر مبنی تنقید سامنے آتی ہے۔

پاکستان جیسے زیادہ تر تیسری دنیا کے ممالک کی 65 فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے جو زرعی زمین سے روزگار اور غذائی تحفظ حاصل کرتی ہے۔ جب یہ زرعی زمین غیرملکیوں کو منافع کے لیے مہیا کی جاتی ہے تو وہ صرف زمین کا استعمال نہیں کرتے بلکہ زرعی پیداوار کے لیے دیگر وسائل بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً پانی، توانائی، بیج اور کھاد وغیرہ۔ ان وسائل کے استعمال سے نہ صرف ملک میں ان اشیاء کی کمی واقع ہوتی ہے بلکہ اس زمین سے پیدا ہونے والی خوراک سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ سب سے اہم ترین نکتہ کسانوں کا زمین پر حق ہے۔ اگر کسی ملک میں کسان آبادیوں کے پاس زرعی زمین نہیں تو ملک میں موجود زمین پر سب سے پہلا حق کسانوں کا ہے نہ کہ غیرملکی کمپنیوں کا۔[1]

زمینی قبضہ: ایک عالمی جائزہ

زمین کی بڑھتی ہوئی مانگ میں کئی عوامل کارفرما ہیں جن میں ایگروفیول کی پیداوار، خوراک کا بحران اور معاشی بحران بنیادی عوامل ہیں۔ دنیا بھر میں خوراک کی بڑھتی ہوئی طلب، بالخصوص ان ممالک میں جہاں آبادی میں اضافہ ہورہا ہے اور وہ مخصوص وجوہات کی بنا پر خوراک کی پیداوار سے محروم ہیں۔ ان ممالک کے لیے اپنے شہریوں کی غذائی ضروریات پوری کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہ دیگر ممالک میں زمین ٹھیکے پر حاصل کرکے اپنی ضروریات پوری کریں۔

زمینی قبضے کے اس عمل میں بحرین، قطر، کویت، سعودی عرب سمیت شمالی افریقہ کے کچھ ممالک جیسے لیبیا اور مصر شامل ہیں۔ یہ ممالک اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تیسری دنیا کے ممالک میں زمین ٹھیکے پر لیتے ہیں۔ ان کا بنیادی مسئلہ ہے کہ یہ ممالک بارانی علاقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں پانی کی کمی ہے۔ اس بات کی تصدیق ہم اس خبر سے بھی کرسکتے ہیں کہ متحدہ عرب امارات میں روڈس گھاس اگانے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ جس کی وجہ بتاتے ہوئے سرکاری حکام کا کہنا تھا کہ اس گھاس کے لیے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔[2] واضح رہے کہ متحدہ عرب امارات میں اس گھاس کے اگانے پر پابندی لگنے کے بعد دبئی کی ایک زرعی کمپنی الدہرہ نے پاکستان میں کئی مقامات پر ٹھیکے پر زمین حاصل کرکے اس کی پیداوار کو جاری رکھا ہوا ہے۔

زمینی قبضے میں براعظم ایشیاء کے بھی چند ممالک، جیسے چین، بھارت، جنوبی کوریا اور جاپان شامل ہیں۔ ان ممالک کی جانب سے زمینوں پر قبضے کی وجہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک کی فراہمی ہے۔

اس کے علاوہ کئی دیگر وجوہات بھی ہیں جو زمینی قبضے میں تیز رفتاری کا باعث ہیں مثلاً بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اور پرآسائش زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زیرزمین ایندھن کے ذخائر ناکافی ہوتے جارہے ہیں۔ چونکہ تیز رفتار صنعتی ترقی توانائی کے بغیر ممکن نہیں اس لیے توانائی کے اس بحران سے نمٹنے کے لیے پچھلی دو دہائیوں سے زرعی اجناس مثلاً سرسوں، کنولا، ارنڈی، سورج مکھی، کپاس، گنا، کھجور، مکئی، شلجم، گندم اور چاول وغیرہ سے توانائی حاصل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ زرعی اجناس سے حاصل کردہ ایندھن کو ایگروفیول کہا جاتا ہے۔[3]

گزشتہ دہائیوں سے ایگروفیول سے بننے والے توانائی کے ذرائع بطور پائیدار ترقی بین الاقوامی قراردادوں کا موضوع ہیں۔ توانائی کے نئے ذرائع کے حوالے سے 1981 میں نیروبی میں ہونے والے اقوام متحدہ کے بین الاقوامی اجلاس میں توانائی کے نئے ذرائع حاصل کرنے کے لیے حکمت عملی وضع کی گئی۔ دوسرا اجلاس 1992 میں اقوام متحدہ کے سائے تلے حیاتیاتی تنوع کے موضوع پر ہوا جس میں کہا گیا کہ ''دنیا میں نباتات کی بقا ایگروفیول سے جڑی ہوئی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ توانائی کی

ضرورت خصوصاً موٹر گاڑیوں کے ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دنیا بھر کے ممالک نے ایگرو فیول کو اپنی حکمت عملی میں سرفہرست رکھا ہوا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی پیداوار کا رجحان جدول 1 سے واضح ہے۔

جدول 1۔ عالمی سطح پر ایگرو فیول کی بڑھتی ہوئی پیداوار

نام	2005 (ملین لٹر)	2010 (ملین لٹر)	2015 (ملین لٹر)
دنیا کی مجموعی پیداوار	48398.06	99423.16	130665.64
یورپی یونین	2940	6230.31	11450.22
برازیل	15711.6	26720.1	38475.03
انڈیا	1120.49	2073.15	2009.2
پاکستان	143.65	263.2	321.8

Source: OECD-FAO Agricultural Outlook 2011-2020: accessed from http://stats.oecd.org/viewhtml.aspx?QueryId=30104&vh=0000&vf= 0&l&il=blank&lang=en

ایک اندازے کے مطابق 2006 میں ہونے والی ایگرو فیول کی پیداوار کو دوگنا کیا گیا تو 2020 تک دنیا بھر میں مزید 90 ملین لوگوں کے لیے بھوک کا خطرہ ہے۔[4] ایگرو فیول کے حصول کے لیے زمین کے استعمال سے نہ صرف اناج اگانے کے لیے زمین میں کمی ہوتی ہے بلکہ اس کے اور بھی نقصانات پائے گئے ہیں۔ جن میں ماحولیاتی صحت کے علاوہ انسانی صحت کے لیے مضر اثرات بھی شامل ہیں۔

زمینوں سے ایگرو فیول حاصل کرنے کے لیے جینیاتی طور پر تبدیل کئے گئے بیج استعمال کئے جارہے ہیں جن میں پودوں کو بیماریوں سے بچانے کے لیے زہریلا مواد شامل کیا جاتا ہے جو ماحول کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایگرو فیول کے حصول کے لیے ایک درخت جت روپھا (Jatropha) کی کاشت کو بھی دنیا بھر میں فروغ دیا جارہا ہے۔ ایک جریدے ''جرنل آف ٹاکسی کالوجی اینڈ انوائرمنٹ ہیلتھ'' کے مطابق جت روپھا کے پھل، بیج، تیل، ٹہنیوں، شاخوں اور پتوں وغیرہ میں زہر موجود رہتا ہے جو چھوٹے سے چھوٹے جاندار سے لے کر بڑے بڑے جانوروں میں منتقل ہوجاتا ہے۔ ایگرو فیول ریفائنری میں کام کرنے والے ایک انجینئر کے مطابق جت روپھا پودے کے بیج اور پتے زہرآلود ہوتے ہیں جنھیں انتہائی احتیاط اور حفاظتی تدابیر کے ساتھ ہاتھ لگانا پڑتا ہے کیونکہ انہیں پیسنے کے دوران ان سے زہریلے بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں جوصحت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔[5]

خوراک اور ایندھن کی پیداوار کے علاوہ سرمایہ کاروں کی زراعت میں سرمایہ کاری کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے کچھ وجوہات کو سرمایہ کاری کرنے والے ایک ادارے شروڈر آلٹرنیٹو انوسمنٹ گروپ کے ایک مسودے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ موجودہ سیاسی، معاشی اور ماحولیاتی حالات میں زراعت میں سرمایہ کاری سے منافع کمانے کے زیادہ امکانات ہیں۔ جن کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ دنیا کی آبادی میں دن بہ دن اضافے کی وجہ سے خوراک کی بڑھتی ہوئی مانگ۔
2۔ شہری وصنعتی ترقی کی وجہ سے زرعی زمینوں میں کمی۔
3۔ زرعی اشیاء کے سستے دام جس کی وجہ سے زراعت میں سرمایہ کاری آسان ہے۔
4۔ منڈی میں موجود زیادہ تر زرعی اجناس کسی کمپنی کی ذاتی ملکیت نہیں۔

شروڈر گروپ اس بات پر زور دیتا ہے کے زراعت کے شعبہ میں نقصانات کا اندیشہ کم کیا جاسکتا ہے کیونکہ زرعی مصنوعات کسی خاص گروہ کی ملکیت نہیں۔ زراعت درج ذیل تین مسائل کی وجہ سے زیادہ منافع بخش ہوتی ہے۔

1۔ مختلف ممالک میں سیاسی حوالے سے غیریقینی حالات۔
2۔ دنیا کے بدلتے ہوئے موسمی حالات۔
3۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی۔[6]

دوسرے لفظوں میں یہ سرمایہ دار ادارہ دنیا کی موجودہ صورتحال میں جہاں ہر ملک میں سیاست، معیشت اور ماحولیات کے حوالے سے غیر یقینی حالات پائے جاتے ہیں، کا فائدہ اٹھانے کے لیے خوراک اور زراعت میں سرمایہ کاری کی تلقین دے رہا ہے۔ اکثر ملکوں کے سیاسی حالات ایسے ہیں کہ کسی وقت بھی کسی ملک میں اشیائے خرد ونوش کی کمی ہوسکتی ہیں۔ مزید یہ کہ اس وقت دنیا شدید موسمی بحران کا شکار ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں کمی اور قلت بھی ہوسکتی ہے۔ ایسے میں سرمایہ کاری کرنے والے گروہ ان وجوہات اورعوام کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زرعی مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے نت نئے طریقے تلاش کررہے ہیں۔

زمینی قبضوں میں اضافہ

اوپر بیان کی گئی وجوہات نے دنیا بھر میں تیزی سے زرعی زمینوں پر ملکی اور غیر ملکی حکومتوں، اداروں اور کمپنیوں کے قبضے میں اضافہ کیا ہے۔ عالمی سطح پر زمینی قبضے تیسری دنیا پر مشتمل تین براعظم لاطینی امریکہ، ایشیاء اور افریقہ میں ہورہے ہیں۔

2008 میں عالمی بینک کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق لاطینی امریکہ میں 3.2 لاکھ ہیکٹرز زمین پہ قبضہ ہوا ہے۔ سب سے زیادہ متاثرہ ممالک میں برازیل، ارجنٹینا اور یورو گئے شامل ہیں۔ زمینی قبضے کے حوالے سے حال ہی میں اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ برائے خوراک و زراعت (FAO) نے بھی ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق گوئٹے مالا کے 220,222 ہیکٹرز زمینی رقبے کا تین چوتھائی حصہ صرف گنے کی پیداوار کے لیے چھ شوگر ملوں کے قبضے میں ہے۔[7]

ایشیاء میں بھی بڑے پیمانے پر زمینی قبضے ہوتے نظر آرہے ہیں، مثلاً فلپائن کی حکومت نے 2012 میں ایک لاکھ ہیکٹرز زمین چین کی ایک کارپوریشن کو فروخت کردی۔ واضح رہے کہ یہ کمپنی اس زمین پر ایگرو فیول کے حصول کے لیے مکئی، چاول اور سواجنا کاشت کرکے اپنے ہی ملک چین برآمد کرے گی۔[8] ایک اخباری مضمون کے مطابق میانمار (برما) میں 1990 کے آخر سے غیر ملکی کمپنیوں کو زمین ٹھیکے پر دینے کے رجحان میں 900 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ملک کا تقریباً پانچ فیصد زرعی رقبہ بیرونی کمپنیوں کے ہاتھ میں آچکا ہے۔ حالانکہ ملک کی کل آبادی 47 ملین ہے جس میں سے 70 فیصد دیہی آبادی کے ایک تہائی کے پاس زمین نہیں۔[9]

جنوبی کوریا اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے 70 فیصد زرعی اجناس درآمد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی کوریا زمین پر سرمایہ کاری کرنے والے ملکوں میں ایک بڑا ملک بن کے سامنے آرہا ہے۔ جنوبی کوریا کی کوشش ہے کہ وہ 2018 تک کمبوڈیا، انڈونیشیا اور یوکرائن سے 940,000 ایکڑ زمین حاصل کرکے اس پر اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مکئی، گندم اور سویابین کاشت کرے۔[10]

ایشیاء کی طرح افریقہ میں بھی زمینی قبضے عروج پر ہیں۔ ایتھوپیا کی حکومت نے 600,000 ہیکٹرز زرعی زمین ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فروخت کردی تھی حالانکہ 2010 میں ہی ایتھوپیا میں 2.8 ملین لوگوں کو ہنگامی غذائی امداد دینے کی ضرورت پیش آئی تھی۔[11] افریقی ملک موزمبیق نے جنوری 2010 میں موریشیس کی حکومت کو 23,500 ہیکٹرز زمین ٹھیکے پر دینے کی پیشکش کی۔ موزمبیق میں انوائرمینٹل جسٹس (Environmental Justice) نامی ماحولیات کے حوالے سے سرگرم تنظیم اور کسانوں کے لیے کام کرنے والی تنظیم نیشنل یونین آف فارمرزان موزمبیق (National Union of Farmers in Mozambique) نے اپنی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ صرف 2007 میں ہی موزمبیق میں ایگرو فیول کے سرمایہ کاروں نے تقریباً پانچ ملین ہیکٹرز زمین کے حقوق کے لیے درخواست دی ہے۔[12]

ستمبر 2008 میں برطانیہ کی توانائی پیدا کرنے والی ایک کمپنی کیمز گروپ (CAMS Group) نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے ایک تجارتی بینک سے قرضہ لے کر افریقی ملک تنزانیہ میں 45,000 ہیکٹرز سے زائد زمین ٹھیکے پر لی ہے۔ کمپنی اس زمین پر جوار (Sorghum) کاشت کرے گی تاکہ اس سے ایگرو فیول حاصل کیا جاسکے۔[13]

پاکستان میں جاری زمینی قبضے

پاکستان میں زمینی قبضے کے حوالے سے اخباری خبروں کا جائزہ لیں تو اس قبضے میں دن بہ دن اضافہ نظر آتا ہے۔ایک خبر کے مطابق کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی (CDA) نے 70 ارب کی لاگت سے چین کے لیے اکنامک زون کے قیام کے لیے راولپنڈی کے 42 دیہاتوں سے 25 ہزار ایکڑ زمین کا حصول شروع کردیا ہے۔ ذرائع کے مطابق حکومت پنجاب اور چین کے معاہدے کے بعد CDA (سی ڈی اے) نے وزیراعظم کی منظوری سے ایک کمپنی ''پاکستان ایونیو ڈیولپمنٹ لمیٹڈ'' بنا کر راولپنڈی کے مضافات میں واقع صدیوں پرانے دیہاتوں سے زمین کا حصول شروع کردیا ہے، خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سی ڈی اے اس زمین کو منڈی سے 90 فیصد کم قیمت پر خریدنا چاہتی ہے۔[14] پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین صدر آصف علی زرداری اور عوام کی منتخب کردہ حکومت نے 2009 کے اوائل میں ایک لاکھ ایکڑ جبکہ بعد میں مزید چھ لاکھ ایکڑ سے زائد زمین 49 سے 99 سال کے لیے ٹھیکے پر دینے کی پیشکش کی۔

صوبہ سندھ کے صحرائی علاقے تھرپارکر جہاں ہر سال خشک سالی اور بھوک سے سینکڑوں انسان بشمول بچے اور عورتیں موت کا شکار ہوتے ہیں، میں حکومت نے عوام کے لیے بہتر سہولیات اور ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے اقدامات کرنے کے بجائے 2009 میں کینڈا کی ایک ایگرو فیول کمپنی کو 150,000 ایکڑ زمین دینے کے لیے یادداشت پر دستخط کیے۔ مشرق وسطی کے ذرائع ابلاغ کے مطابق گزشتہ سالوں میں وزیر اعلی بلوچستان نے بھی ایک یادداشت پر دستخط کرنے کی پیشکش کی جس میں وہ بلوچستان کی 200,000 ایکڑ زمین ابراج گروپ کو فراہم کرنے کے لیے راضی تھے۔ اسی طرح 2012 کی ایک رپورٹ کے مطابق متحدہ عرب امارات کے ''امارات سوریجن ویلتھ فنڈز'' اور ابراج گروپ مشترکہ طور پر زرعی کاروبار کے لیے 800,000 ایکڑ زمین حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور فی الحال اس کا محل وقوع خفیہ رکھا گیا ہے۔[15]

ورلڈ بینک اور ایف اے او کے پیش کردہ اصول برائے زمینی قبضے

2008 میں خوراک کی قیمتوں کے شدید بحران کے بعد 2009 کے آغاز میں ورلڈ بینک نے 14 ممالک کا تحقیقی مطالعہ کیا۔ جس کا عنوان تھا ''رائزنگ گلوبل انٹرسٹ ان فارم لینڈ''۔[16] اس تحقیق میں ان 14 ممالک میں ہونے والے زمینی قبضوں پر تفصیلات پیش کی گئی ہیں اور اس تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات کے تحت زمینی قبضے پر پالیسی سازی کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اس تحقیق کے بعد ورلڈ بینک، FAO (ایف اے او) اور انٹرنیشنل فنڈ فار ایگریکلچر ڈیولپمنٹ (IFAD) نے مشترکہ مسودہ پیش کیا جس میں زراعت اور وسائل کے استعمال کے حوالے سے سات اصول وضع کیے گئے۔[17] ان سات اصولوں کو اکثر ''پرائے'' (Principles for Responsible Agricultural Investment that Respects Rights, Livelihoods and Resources/PRAI) اور اکثر ''رائے'' (RAI) بھی کہا جاتا ہے۔ ان اصولوں کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

اگر کسی بھی شخص یا آبادی کے پاس روایتی یا قانونی طور پر کوئی زمین یا اس سے جڑے وسائل ہوں تو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کہیں پر سرمایہ کاری ہورہی ہوتو

اس سے مقامی آبادیوں کے غذائی تحفظ پر منفی اثرات نہ ہوں۔ زمین کی لین دین، اس کی خاصیت اور محصولات کے حوالے سے تمام معلومات شفاف ہوں اور عوام کی ان کاغذات اور معاہدوں تک رسائی ممکن ہو۔ سرمایہ کار نہ صرف مقامی لوگوں سے مشاورت کریں بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کی سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا منافع علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔ منصوبے میں معاشرے کے کمزور گروہوں اور عورتوں کے مفادات کا خاص خیال رکھیں۔ ان اصولوں میں ماحول کی صحت کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کوئی بھی منصوبہ ماحولیاتی آلودگی کا سبب نہ ہو۔ زراعت اور اشیاء کی تیاری کے لیے ماحول دوست اور پائیدار طریقوں کو اپنایا جائے۔

ورلڈ بینک کے زمینی قبضوں پر پیش کردہ اصولوں پر عوامی گرہوں کی جانب سے شدید تنقید سامنے آئی۔ ایک بین الاقوامی عوامی گروہ گرین (GRAIN) کے مطابق اس امر کی ضرورت نہیں کہ زمینی قبضے کے لیے اصول وضوابط بنائے جائیں بلکہ غیر ملکی قبضے کو مکمل طور پر بند کردینا ہی خاطر خواہ عمل ہے۔[18]

عوامی گروہوں نے جب ورلڈ بینک کے پیش کردہ ''رائے'' اصولوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تو ایف اے او نے ایک نئی دستاویز قدرتی وسائل تک رسائی اور ان کے استعمال کے حوالے سے رضاکارانہ ہدایت نامہ یعنی والینٹری گائیڈ لائنز آن دی گورننس آف ٹینیور (Voluntary Guidelines on the Goverance of Tenure) کے نام سے شائع کیا۔ اس مسودے کو بھی اکثر ''رائے'' (rai) کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں نام کا فرق بڑے اور چھوٹے حروف سے کیا جاتا ہے لیکن اردو میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک مسودہ ورلڈ بینک کا ہے اور دوسرا اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے تحفظ خوراک اور ایف اے او کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ تحفظ خوراک کی کمیٹی اور ایف اے او کی طرف سے پیش کردہ رضا کارانہ ہدایت نامے میں حکومت کی ذمہ داریاں کچھ یوں بیان کی گئی ہیں۔

1۔ قدرتی وسائل جیسے زمین، جنگلات اور ماہی گیری تک سب کی رسائی ممکن بنانا۔
2۔ لوگوں کی حفاظت کرنا اور ان کو زمینوں سے بے دخل کرنے سے بچانا۔
3۔ اس بات کو یقینی بنایا جانا کہ کسی کے ساتھ بھی امتیازی سلوک نہ برتا جائے۔
4۔ قانون سب کے لیے برابر ہو۔ جب کسی بھی قانون پر عمل درآمد کا وقت ہو تو سب کے ساتھ یکساں پیش آئے۔
5۔ کسی بھی مسئلے کے بڑھنے سے پہلے اسے حل کرنے کی کوشش کرنا۔
6۔ انتظامی امور کو سب کے لیے آسان بنانا اور زیادہ سے زیادہ پھیلانا۔[19]

اگر ہم کمیٹی برائے تحفظ خوراک اور ایف اے او کے اس ہدایت نامے کا جائزہ لیں تو زمینی حقائق ہدایت نامے کے برعکس نظر آتے ہیں۔ اوپر بیان کی گئی اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق قدرتی وسائل اور زمین تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کی کل آبادی میں سے ایک ارب افراد بھوک و افلاس کا شکار ہیں جن میں 70 فیصد چھوٹے کسان اور مزدور ہیں۔ اگر زمین، جنگلات اور ماہی گیری تک لوگوں کی رسائی ہوتی تو دنیا میں کوئی بھی بھوک کا شکار نہ ہوتا۔ اگر ہم آبادیوں کو ان کی زمینوں سے ہٹانے کے لیے حکومتی کرداروں کا جائزہ لیں تو ہر ملک کی حکومت بشمول عالمی ادارے ایسے قوانین اور تجارتی راستے ہموار کرتے ہیں جس کا فائدہ صرف سرمایہ کاروں کو ہوتا ہے۔ اگر ہم قانون کی پاسداری اور یکساں عمل درآمد کی بات کریں تو یہ ایک عام بات ہے کہ پاکستان جیسے نیم جاگیردار ملک میں قانون صرف غریبوں کے لیے ہوتا ہے۔ سرمایہ دار یا جاگیردار مزدور کسان پر کسی بھی قسم کا ظلم برتنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ قانون اس ظلم کے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھاتے نظر نہیں آتا جو جاگیردار یا سرمایہ دار کو سزا دے۔

کمیٹی برائے تحفظ خوراک اور ایف اے او کے ''رائے'' مسودے پر پیپلز کولیشن آن فوڈ سورنیٹی (PCFS) نے سخت تنقید کی ہے جس کے مطابق یہ ہدایت نامہ بڑی بڑی کمپنیوں اور امیر ریاستوں کو عالمی غذائی نظام پر اختیار اور اجارہ داری میں مدد دیتا ہے اور آزاد تجارت کے اصولوں کو زراعت میں مزید جگہ فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ خوراک کی خود مختاری جو عوامی گروہوں کا بنیادی مطالبہ ہے، کو یکسر نظر انداز کرتا ہے۔ یہ مسودہ نا کہ عوامی گروہوں اور کسانوں کو خوراک کی پیداوار میں اپنے حقوق کے استعمال اور منوانے کی جگہ دیتا ان کو مزید کمزور کیا گیا ہے۔[20]

ایف اے او کے ہی اعداد وشمار کے مطابق اس وقت دنیا کی سات ارب آبادی میں سے ایک ارب آبادی بھوک کا شکار ہے۔ ان حالات میں غذائی تحفظ کے حوالے سے صرف سفارشات پیش کرنے کی بجائے ایسے قوانین بنانے کی ضرورت ہے جس میں سرمایہ دار ممالک اور امیروں کے بجائے صرف مقامی لوگوں خصوصاً کسان و مزدوروں کے حقوق کا تحفظ ہو۔ خیال رہے کہ تحفظ خوراک اور غذائیت کی کمی کے حوالے سے ایف اے او نامیاتی مرکبات کی کمی کو بھی اہمیت دیتا ہے لیکن نامیاتی کمی کی اصل وجہ کیمیائی کھاد، زہریلی ادویات کے استعمال کے خلاف عملی کاروائی نہیں کرتا جو کہ زرعی پیداوار میں سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیوں کے لیے اہم ترین مداخل ہیں جن کے ذریعے یہ کمپنیاں زیادہ سے زیادہ پیداوار اور منافع حاصل کرتی ہیں۔

موجودہ عالمی پالیسوں کے ہوتے ہوئے قبضہ کی گئی زمینوں پر کام کرنے والے مقامی لوگوں کے معیار زندگی اور آمدنی میں اضافہ تو ناممکن ہے البتہ ان عالمی اداروں خصوصاً ڈبلیو ٹی او کے عملی اقدامات جیسے آزاد تجارت کے تحت چلنے والی معیشتوں میں بے روزگاری اور مہنگائی معمول کی بات ہے۔ سبز انقلاب کی پالیسی میں کسانوں کی جگہ مشینری نے لی۔ سارا کام مشین سے ہونے کی وجہ سے کسان کی روزی، آمدنی میں دن بہ دن کمی آرہی ہے۔ عالمی ادارے عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے ایسے مسودے پیش کرتے ہیں جس میں مقامی طور پر بننے والی اشیاء کے فروغ اور استعمال پر ترغیب تو دے رہے ہیں پر انہی اداروں کی مرتب کردہ پالیسی سے زمینی قبضوں کو مزید فروغ مل رہا ہے۔

جن علاقوں میں زمینوں پر قبضہ کرکے کارپوریٹ زراعت کی جاتی ہے وہ علاقے پسماندہ ہوتے ہیں۔ ایسے علاقوں میں روایتی کھیتی باڑی میں قدرتی وسائل کا استعمال بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ قدرت کے بے تحاشہ وسائل کا کسان محدود استعمال کرتے ہیں۔ اکثر کسان روایتی اقسام اگا کر اور دیسی مال مویشی اپنے روایتی طریقہ کار اور علم کی بنیاد پر پالتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ماحولیاتی نظام کی بہتر حفاظت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مقامی لوگوں کو ہٹا کر زمین غیر ملکیوں کو دیے جانے سے انسانی آبادیوں اور ماحول کے درمیان تناسب بگڑ سکتا ہے۔ سرمایہ دار زراعت میں بڑے پیمانے پر صنعتی طریقہ کار استعمال کرتے ہیں جو موسمی تبدیلی کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ ہے۔ کیمیائی کھاد اور زرعی زہریلی ادویات کے مضر اثرات زمین کی زرخیزی ختم کردیتے ہیں اور پانی کو آلودہ کرتے ہیں۔ زمینی قبضوں میں بڑے پیمانے پر ایک ہی فصل کی کاشت اور مخصوص درختوں کی اقسام جیسے کھجور اور سفیدے لگانے سے اس علاقے کی آبی و زمینی حیات کے ساتھ ساتھ وہاں کے مقامی ماحول پر بھی برے اثرات دیکھے گئے ہیں۔[21]

زمین اور قدرتی وسائل تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے بھوک و افلاس میں اضافہ ہوا ہے جو زیادہ تر دیہی علاقوں میں دیکھا گیا ہے۔ یعنی حقیقت میں عوام کے لیے خوراک اگانے والا کسان خود شدید بھوک کا شکار ہے۔ اس بات کا اعتراف خود اقوام متحدہ کا ادارہ کانفرس آن ٹریڈ اینڈ ڈیولپمنٹ (United Nations Conference on Trade and Development) کرتا ہے کہ دنیا کے ایک ارب شدید بھوک و افلاس کے شکار لوگوں میں 70 فیصد خود چھوٹے کسان اور کسان مزدور ہیں۔[22] پوری دنیا کے لیے خوراک مہیا کرنے والوں کے خود بھوک میں رہنے کی وجہ ان کے پاس زمین کا نہ ہونا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک ان چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے پاس اپنی زمین نہیں ہوگی اس دنیا سے بھوک و افلاس کم نہیں ہوگی جس کے لیے عالمی اداروں جیسے کہ اقوام متحدہ کو قرارداد پاس کرنے کے بجائے ایسے عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جس سے دنیا بھر کی زرعی زمینوں پر چند منافع پرست کمپنیوں کے بجائے ان زمینوں پر دن رات محنت کرنے والے کسانوں کا حق ہو۔

پیسٹی سائڈ ایکشن نیٹ ورک ایشیا و پیسفیک {(PAN-AP) جو پیسٹی سائڈ ایکشن نیٹ ورک کے پانچ علاقائی مراکز میں سے ایک ہے اور دنیا بھر کے انسانوں اور ماحول پر زرعی زہریلی ادویات کے مضر اثرات کو ختم کرنے اور حیاتیاتی تنوع پر مبنی پائیدار زراعت کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے} کا کمیٹی برائے تحفظ خوراک کے ''رائے'' مسودے پر تنقید کرتی ہے کہ:[23]

1۔ رائے پرنسپل انسانی حقوق کے خلاف اور سرمایہ دارانہ حکومتی سوچ پر مبنی ہے۔ یہ اصول جزوی طور پر تحفظ خوراک کے نام پر سب کے لیے مناسب اور مطلوبہ مقدار میں خوراک دینے کی بات کرتا ہے لیکن بین الاقوامی تجارتی قوانین اس کے برخلاف ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تیسری دنیا میں بڑھتی ہوئی بھوک و افلاس اور زراعت کو تباہ کرنے کا اصل ذمہ دار ڈبلیو ٹی او اور آزاد تجارت کے اصول ہیں۔ ان زرعی پالیسیوں میں تیسری دنیا کے ممالک میں مراعات کا خاتمہ، ذخیرہ اندوزی اور ذہنی ملکیت کے معاہدے شامل ہیں۔ جن کی وجہ سے چھوٹے کسانوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

2۔ رائے پرنسپل چھوٹے کسانوں اور چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والوں کے بلبوطے کارپوریٹ زراعت کو فروغ دیتے ہیں۔ اکتوبر 2011 میں کمیٹی برائے تحفظ خوراک نے اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ چھوٹے کاشت کار زراعت میں سرمایہ کاری کے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں اور مقامی طور پر استعمال ہونے والی خوراک کی پیداوار میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں پر یہ اصول ایسے حقائق کو اجاگر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ اصول چھوٹے کسانوں کی بہتری کے بجائے ان تمام پیداواری نظاموں کو فروغ دیتی ہے جن میں کارپوریٹ زراعت بھی شامل ہے جو ماحول کی تباہی کے ساتھ تیسری دنیا کے ملکوں کی معیشت کی تباہی و بدحالی اور مقامی لوگوں کے معاشرتی و ثقافتی حقوق کی پامالی کا سبب ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے پیداواری طبقے کو کلیدی اہمیت نہیں دی جاتی اس لیے بڑے سرمایہ کاروں کے زمینی قبضوں جن کو اکثر مقامی اور قومی حکومتیں سہارا دیتی ہیں، سے چھوٹے کسانوں کو محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔

3۔ رائے پرنسپل بے زمین کسانوں کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ مثلاً IFAD (آئی ایف اے ڈی) کے مطابق دنیا بھر میں 1.1 ارب غریب لوگ بے زمین ہیں۔ مگر افسوس یہ اصول ان بے زمینوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایف اے او کے دیگر دستاویز میں چھوٹے کسانوں کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ''ایسے کسان، گلہ بان، ماہی گیر یا جنگلات کے نگران جو ایک ہیکٹر سے کم اور 10 ہیکٹرز تک زمین سنبھال سکتے ہوں''۔ بے زمین کسانوں کو تسلیم نہ کرنے کا مطلب حقیقی زمینی اصلاحات کی ضرورت کو نظرانداز کرنا ہے جس کے ذریعے ہی دیہی علاقوں میں ہونے والی تاریخی ناانصافی سے نمٹنا ممکن ہے۔ اگر ان اصولوں کو حقیقی معنوں میں حقوق کی بنیاد پر ایک دستاویز بنانا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں ایسے اہم مسئلے جیسے وسائل (زمین) پر حق کو اجاگر کریں۔ اس حق کے نہ ملنے سے غریب دیہی علاقوں میں انسانی حقوق کی پامالی کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ بے زمینی کے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے کمیٹی برائے تحفظ خوراک کے دستاویزات سے لفظ ''بے زمین'' کو ہی نکالا جارہا ہے اور منصفانہ زمین کی تقسیم کے لیے عوامی تحریکوں اور کسانوں کی طویل سخت جدوجہد کو خاص کرکے غریب ممالک میں بالکل نظرانداز کیا جارہا ہے۔

پوری دنیا میں بڑھتے ہوئے زمینی قبضے کی وجہ سے ہونے والی انسانی حقوق کی پامالی اور بے زمینوں کی مشکلات اور اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ایشیا کی سطح پر ایک چھوٹے بے زمین کسانوں کے اتحادی گروہ ایشین پیزنٹ کولیشن (APC) کی

طرف سے 29 مارچ، 2015 کو بے زمینوں کا دن ''Day Of the Land less'' کے نام سے منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ آج سے 12 سال پہلے اسی تاریخ کو APC (اے پی سی) کے قیام کو عمل میں لایا گیا تھا۔ پوری دنیا کے مختلف ممالک کے چھوٹے اور بے زمین کسانوں نے اس دن کو مناتے ہوئے اپنے ملکوں میں مظاہرے کیے۔ اے پی سی نو ممالک کی 37 کسان تنظیموں پر مشتمل ہے۔ یہ تنظیمیں اپنے ممالک میں چھوٹے کسان و مزدور کے حقوق کے لیے کام کرتی ہیں۔[24] اسی حوالے سے پاکستان میں اے پی سی کے رکن پاکستان کسان مزدور تحریک اور روٹس فار ایکوٹی کے زیر اہتمام صوبہ پنجاب کے شہر ملتان میں ایک احتجاجی ریلی اور پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کیا گیا۔ جس میں پاکستان بھر سے چھوٹے اور بے زمین کسانوں نے شرکت کرتے ہوئے بڑی کمپنیوں کی حکومتی سرپرستی میں زمینی قبضے، وسائل کی لوٹ مار اور آبادیوں کی بے دخلی کے خلاف نعرے بلند کیے۔[25]

اس میں شک نہیں کہ کسان اور کسان دوست تنظیموں کو زمینی قبضے کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنے کی اشد ضرورت ہے!

حوالہ جات

1. Transnational Institute (TNI). "The global land grab: a primer." February, 2013. Accessed from http://www.tni.org/primer/global-land-grab

2. "Abu Dhabi halts Rhodes grass planting." Emirates 24|7 News, October 18, 2010. Accessed from http://www.emirates247.com/news/emirates/abu-dhabi-halts-rhodes-grass-planting-2010-10-18-1.305519

3۔ سومرو، ارشاد۔ ''ایگرو فیول کی پیداوار: موسمیاتی بحران کا حالیہ منافع کی حوس''۔ چیلینج، جولائی تا ستمبر 2011، صفحہ 6۔

4. Biofuel.ORG.UK. "Disadvantages of biofuels; food production." Biofuel.ORG.UK. Accessed from http://biofuel.org.uk/disadvantages-of-biofuels.html

5۔ سومرو، ارشاد۔ ''ایگرو فیول منافع کی حوس، موسمی بحران سے خراک کے بحران تک۔'' روٹس فار ایکوٹی، فروری، 2012، صفحہ 8۔

6. Schroders. "Schroders Alternative Investment Group, agriculture." SAS, May 2008.

7. Gomez, Serbio (ed.). "The land market in Latin America and the Caribbean: concentration and foreignization." Food and Agriculture Organization of the United Nations (FAO), 2014, p. 5. Accessed from http://www.fao.org/3/a-i4172e.pdf

8. GRAIN. "Hybrid rice and China's expanding empire (Part 1)." February 6, 2007. Accessed from http://www.grain.org/article/entries/1626-hybrid-rice-and-china-s-expanding-empire-part-1

9. Prosterman, Roy and Vhugen, Darryl. "Land to the Tillers of Mynamar." The New York Times, June 13, 2012. Accessed from http://www.nytimes.com/2012/06/14/opinion/land-to-the-tillers-of-myanmar.html?_r=0

10. Brown Lester, Brown, R. "Food, fuel and the global land grab." The Futurist. World Future Society. January-February (Vol. 47, No.1), 2013. Accessed from http://www.wfs.org/futurist/january-february-2013-vol-47-no-1/food-fuel-and-global-land-grab

11. Cochrane Logan, "Food security or food sovereignty: The case of land grabs." July 5, 2011. Accessed from https://sites.tufts.edu/jha/archives/1241

12. Kachika, Tinyada "Land grabbing in Africa: a review of the impacts and the possible policy responses." Year? p. 23. Accessed from http://www.oxfamblogs.org/eastafrica/wp-content/uploads/2010/11/Land-Grabbing-in-Africa.-Final.pdf

13. Cotula, Lorenzo, Vermeulen, Sonja, Leonard, Rebeca and Keeley, James. "Land grab or development opportunity? Agricultural investment and international land deals in Africa." IIED/FAO/IFAD, London/Rome, 2009, p. 37. Accessed from http://webcache.googleusercontent.com/search?q=cache:fB1ISDoIr0QJ:www.fao.org/3/a-ak241e.pdf+&cd=1&hl=en&ct=clnk

14۔ حسن، صبیحہ (ای ڈی۔)۔ ''حال احوال'' روٹس فار ایکوٹی، ستمبر تا دسمبر 2013، صفحہ 1۔

15. Sadeque, Najma. "The global and local land-grab." The Express Tribune, October 29, 2012. Accessed from http://tribune.com.pk/story/457897/the-global-and-local-land-grab/

16. Deininger, Klaus et al. "Rising global interest in farmland: can it yield sustainable and equitable benefits?" Washington DC, The World Bank, 2011.

17. FAO, IFAD, UNCTAD, and the World Bank Group. "The principles for responsible agricultural investment that respects rights, livelihoods and resources: extended version." January 25, 2010. Accessed from http://siteresources.worldbank.org/INTARD/214574-1111138388661/22453321/Principles_Extended.pdf

18. GRAIN. "Responsible farmland investing? Current efforts to regulate land grabs will make things worse." Against the Grain, Grain, August 22, 2012. Accessed from http://www.grain.org/article/entries/4564-responsible-farmland-investing-current-efforts-to-regulate-land-grabs-will-make-things-worse

19. Food and Agriculture Organization of the United Nations (FAO). "Voluntary guidelines on the governance of tenure: at a glance." Rome, 2012. Accessed from http://www.fao.org/docrep/016/i3016e/i3016e.pdf

20. People's Coalition on Food Sovereignty (PCFS)." An initial statement on the Zero Draft of the Principles for Responsible Agricultural Investments (rai) in the context of food security and nutrition " PCFS, August 2013. Accessed from http://www.foodsov.org/sites/foodsov/files/PCFS_Critique_on_rai.pdf

21. Slow Food. "Impacts: the social and environmental consequences of land grabbing." Accessed from http://www.slowfood.com/international/137/impacts

22. United Nations Conference on Trade and Development (UNCTAD). "Trade and Environment Review, 2013." Accessed from http://unctad.org/en/pages/publicationwebflyer.aspx?publicationid=666

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 33 پر دیکھیں)

بات تو سچ ہے مگر

اسلام میں زمین کا حق

اسلام میں ہر چیز بشمول خود انسان خدا کی ملکیت ہے۔ زمین اور اسکی تمام اشیاء اسی کی ہیں جو انسان کو امانت کے طور پر دی گئیں ہیں کہ وہ اسے اپنے اور دوسروں کے فائدے کے لیے عقلمندی سے استعمال کرے۔مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے کہ ''جو کچھ زمین پہ ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے سب کچھ اسی کا ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے۔'' (20:6)

اسلام میں تخلیقی اور کاروباری صلاحیتوں کے فروغ کے لیے فاضل اشیاء کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر انسانی فلاح کی قیمت پر نہیں۔ قرآن میں کوئی مخصوص ہدایات نہیں ہیں کہ زمین کی تقسیم کیسے ہوگی مگر اس نے اسلامی معاشرے کے کھرے اور منصفانہ اصول وضع کئے ہیں۔صدیوں سے مسلمانوں نے اپنی صلاحیت کے استعمال سے صحیح اور غلط کے فیصلے، زمین کی پیائش، منصوبہ بندی اور محصولات کا نظام وضع کیا جو چند لوگوں کی طرف سے کیے جانے والے استحصال کو روکتا ہے۔ ریاست کی زمین کی کسانوں میں تقسیم عین اسلامی عمل ہے۔ خلیفہ عمر فاروقؓ نے فتوحات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی زمین اس خوف سے سپاہیوں میں تقسیم نہیں کی کہ زمین چند افراد کی میراث نہ بن جائے۔ زمینی حصہ ریاست کے پاس رکھا گیا اور اس زمین کو عام لوگوں کے استعمال میں لایا گیا۔

اسلام ایسی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا جو صرف چند لوگوں کے استعمال کے لیے مخصوص ہو بلکہ باقاعدہ شرائط کے تحت ملکیت دی گئی اور جنہیں یہ اعتماد دیا گیا ہے ان پر بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کی فلاح کا خیال رکھیں۔ جو یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو ریاست کے پاس پورا اختیار ہے کہ ان سے زمین لے کر وسیع تر عوامی مفاد میں معاشی فائدے کے لیے استعمال کرے۔ لفظ انصاف قرآن میں اللہ اور علم کے بعد تیسرا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں برابری، سچائی، ہمدردی کو یقینی بنائیں جو خدائی صفت اور مساوات کی آئنہ دار ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے انفرادی طور پر یا ریاستی سطح پر غیر قانونی اور زبردستی کسی کی زمین پر قبضے کی ممانعت کی ہے۔

اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ غربت اور ناانصافی دونوں پاکستان میں بہت زیادہ ہیں اور ملک میں تعلیم، صحت، غذا اور بنیادی سماجی خدمات کی بھی کمی ہے۔ خاص کر دیہی علاقوں میں زیادہ تر بے زمین اور چھوٹی زمین رکھنے والے کسانوں کی حالت کافی ابتر ہے۔ زیادہ تر زرعی زمین چند جاگیردار گھرانوں کے قبضے میں ہے جبکہ وہ کسان جن کی اپنی کچھ زمین ہے بھی انہیں پانی کے مسائل درپیش ہیں۔ سماجی اور معاشی حالات واضع طور پر بتاتے ہیں کہ ملک میں موجودہ زمینی اجارہ داری کا بھوک اورمحرومی بڑھانے میں اہم کردار ہے۔ آج کے سماجی اور معاشی حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی بھوک اور محرومی کی وجہ زمین کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ شریعت کورٹ کا یہ فیصلہ سمجھ سے بالا تر ہے کہ زمینی اصلاحات غیر اسلامی ہیں۔ یہ واضع ہے کہ کئی مواقعوں پر ریاست اس معاملے میں کردار ادا کرسکتی تھی مگر نہیں کیا گیا۔ من وعن تشریح کو فوقیت دیتے ہوئے واقعاتی مباحثہ اور اجتہاد کو نظرانداز کیا گیا جسے ہمیشہ سے مسلمان دانشوروں کو اپنانے کا کہا گیا تھا۔

نامور عالم جاوید احمد غامدی بتاتے ہیں کہ آزادی سے پہلے برطانوی حکومت نے بہت سی زمین انفرادی طور پر تقسیم کی اگرچہ بہت سے مسلمان معاشرے زمین کو مشترکہ فوائد کے لیے استعمال کر رہے تھے لیکن انفرادی طور پر دی گئی ان زمینوں پر جاگیرداروں نے اپنا حق سمجھ لیا۔ اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زمین کے حق شراکت کو سمجھ کر فیصلہ کریں کہ کیا 1947 سے پہلے اور بعد میں بٹوارہ قانونی اور کھرا تھا تو شاید یہ فیصلہ خطرناک حد تک آمدنی میں عدم مساوات، بھوک اور افلاس کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

(ڈان، 2 جنوری، 2015، صفحہ 9)

زمین

سپریم کورٹ نے سندھ بورڈ آف رونیو کے رکن اعلی کو حکم دیا ہے کہ صوبے کا زمینی ریکارڈ جلد از جلد ازسرنو مرتب کرکے کمپیوٹرائز کیا جائے۔ جسٹس عامر ہانی مسلم کی سربراہی میں عدالتی بینچ نے زمینی ریکارڈ کی کمپیوٹرائزشن کے عمل پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ بینچ نے بورڈ کے رکن شاہد گلزار سے مانیٹرنگ اینڈ ایولیشن (جانچ پڑتال) ڈائریکٹریٹ کے گزشتہ پانچ سالوں میں کیے گئے کاموں کے متعلق پوچھا جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ڈائریکٹریٹ کی اسامی خالی ہے اور اب تک اس پر تعیناتی نہیں ہوئی ہے۔ بورڈ کی جانب سے زمینی ریکارڈ کی کمپیوٹرائزشن کے حوالے سے رپورٹ جمع کرائی گئی۔ رپورٹ دیکھنے کے بعد عدالت کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ بورڈ نے ریونیو ریکارڈ کی کمپیوٹرائزشن ایک ویب سائٹ کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی جس میں صرف کچھ دیہات کی معلومات دستیاب تھیں جو نامکمل تھیں۔ کچھ دیہات کے اندراج میں زمین کا درجہ بھی واضع نہیں۔ عدالت کا کہنا تھا کہ ایسے

اقدامات سے منصوبہ مطلوبہ اہداف حاصل نہیں کرسکے گا۔ پنجاب حکومت نے تمام ریونیو ریکارڈ ازسرنو مرتب کرلیا ہے لیکن سندھ میں کمپیوٹرائزیشن کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ عدالت کو بتایا گیا کہ زمینی ریکارڈ کمپیوٹرائز کرنے کا کام مختلف نجی کمپنیوں کو دیا گیا ہے اور 100 ملین روپے سے زیادہ رقم ٹھیکیداروں کو کام مکمل کرنے کے لیے دی جاتی رہی ہے۔

بورڈ نے داخل کیے گئے جواب میں کہا ہے کہ 40 سے 50 فیصد دیہات سروے میں موجود نہیں ہیں جو مشکلات پیدا کررہے ہیں۔ ریکارڈ کی کمپیوٹرائزیشن کا عمل چھ ماہ میں مکمل کرلیا جائے گا۔ عدالت نے اس پر کہا کہ ریکارڈ کا اندراج نہ کرنا زمین کے لین دین بدعنوانی اور بے ایمانی چھپانے کے لیے کیا گیا۔ عدالت نے مزید کہا کہ مختیار کار اور تپہ داروں سے متعلق شکایات اعلیٰ حکام تک ضرور پہنچتی ہونگی لیکن محکمہ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ عدالت نے بورڈ آف ریونیو کو حکم دیا کہ وہ جلد از جلد ریکارڈ کو کمپیوٹرائز کرکے ازسرنو مرتب کرے۔

(دی نیوز، 28 فروری، 2015، صفحہ 20)

موسمی تبدیلی: پانی کی کمی تحفظ خوراک کے لیے خطرہ

امریکی امداد دینے والے ادارے یو ایس ایڈ (USAID) کی مالی امداد سے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں تعمیر کیے گئے ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان فوڈ سیکیورٹی اینڈ ایگریکلچر سینٹر میں ہونے والے پہلے اجلاس میں ادارے کے ڈائریکٹر بشیر احمد نے کہا کہ جنگلات کی کٹائی، سیلاب، موسمی تبدیلی، پانی کی قلت اور پیشگی اطلاع کے نظام کی کمی تحفظ خوراک کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ملک کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، پانی کے ذخائر تیزی سے ختم ہورہے ہیں اور زرعی زمین کم ہورہی ہے۔ انہوں نے غذائی عدم تحفظ اور زراعت میں موسم کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اقدامات پر زور دیا۔ ڈاکٹر بشیر احمد کے مطابق مرکز میں تحقیق اور پالیسی کے تحت کام کرنے کے لیے ایک کونسل ہوگی جو ترقی کے لیے ''تھنک ٹینک'' یعنی پالیسی پر سوچ بچار کے لیے کام کرے گی اور ایسی پالیسیوں کی سفارش، ترقی اور جائزہ لے سکے گی جو تحقیق اور تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دے۔ یہ مرکز ہر سال ضرورت مند اور با صلاحیت 100 پوسٹ گریجویٹ (20 پی ایچ ڈی، 80 ایم ایس) سکالرشپ اور تقریباً 200 طالب علموں کو یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، امریکہ بھیجے گی۔ اس کے علاوہ پانچ نئے پوسٹ گریجوٹ ڈگری پروگراموں کا آغاز بھی ہوگا۔ موسمیاتی تحقیق کے سربراہ ڈاکٹر اشفاق احمد نے کہا کہ ہمیں زرعی ماحولیات کی پھر سے تشریح کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ موسم سے مطابقت رکھنے والی جینیاتی فصلوں اور زراعت سے متعلق موسمی پیشنگوئی نظام کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔

(ڈان، 23 فروری، 2015، صفحہ 10)

کسانوں کو خشک سالی کا سامنا

آسٹریلیا کے قصبے والگیٹ جانے والی سڑک پر لگا ایک بورڈ یہاں آنے والوں کا اس عبارت سے استقبال کرتا ہے ''کھیتی باڑی ایک طرز زندگی نہیں بلکہ یہ ہر ایک کو زندہ رکھتی ہے''۔ مگر اب خشک سالی اس علاقے سے بھاری خراج وصول کررہی ہے اور کھیتی باڑی کی بقا ایک جنگ بن گئی ہے۔ اس زرعی قصبے کا نام والگیٹ ہے۔ والگیٹ ایک مقامی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''دو دریاؤں کا ملنا''۔ یہ خطہ اس وقت صدی کی بدترین خشک سالی کی زد میں ہے جہاں کسان زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 7 مارچ 2015، صفحہ 16)

پانچ لاکھ ٹن گندم کی برآمد

وفاقی حکومت کی جانب سے منظوری کے بعد حکومت سندھ نے پانچ لاکھ ٹن گندم 50 ڈالرز فی ٹن زرتلافی پر برآمد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ فیصلہ وزیر اعلیٰ سندھ کے زیر صدارت اضافی گندم پر ہونے والے ایک اجلاس میں کیا گیا۔ صوبے میں اس وقت تقریباً 745,000 ٹن اضافی گندم موجود ہے۔ جس میں سے سندھ حکومت نے 660,000 ٹن گندم برآمد کرنے کی اجازت مانگی تھی۔

صوبائی حکومت پہلے ہی کسانوں سے گندم خریدنے کی مد میں سات ارب روپے زرتلافی پر خرچ کر چکی ہے اس لیے سندھ وفاقی حکومت کو گندم برآمد کرنے کے لیے مزید 50 فیصد زرتلافی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ گندم کی قیمت کم ہوکر 3,250 روپے فی بوری ہونے کے باوجود گندم کے پرانے ذخائر تسلی بخش طور پر کم نہیں ہوئے۔ حکام کو ہدایت کی گئی ہے کہ تین ماہ کے لیے تاجروں کو بینک ضمانت پر گندم قرض پر دینے کے لیے منڈی تلاش کریں۔ اس کے علاوہ تاجروں کے نقل و حمل کے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے تاجروں کو کھلے ذخائر اور ملوں کے خریداری مراکز سے 50 فیصد گندم کے ذخائر اُٹھانے کی اجازت بھی دی ہے۔ سیکرٹری خوراک سعید اعوان کے مطابق سندھ کے پاس 1,119,000 بوری گندم تھی جن کی کم قیمت پر فروخت جاری رہے گی۔

(دی نیوز، 1 جنوری، صفحہ 19)

ناقص پالیسی: سستی گندم کی درآمد پر بھاری نقصان

ملک میں گندم کے اضافی ذخائر ہونے کے باوجود وفاقی حکومت کی ناقص پالیسی کی وجہ سے سندھ کی آٹا ملیں سستی گندم درآمد کرکے لاکھوں ڈالرز کے نقصان کا سبب بنی ہیں۔ حکام کے مطابق حکومت کو گندم کے ذخائر اور گندم کی آنے والی فصل کو مدنظر رکھتے ہوئے برآمدات اور درآمدات پر پالیسی وضع کرنا چاہئے تھی تاہم ایسا کوئی قدم نہیں

اُٹھایا گیا جس نے آٹا ملوں کو منڈی میں من مانی کا موقع فراہم کیا۔

23 جنوری کو اقتصادی رابطہ کمیٹی کے اجلاس میں توجہ دلائی گئی تھی کہ پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن سندھ زون نے 611,000 ٹن گندم، روس سے سستے داموں درآمد کی ہے۔ درآمدی گندم وافر ہونے کی وجہ سے آٹا ملیں حکومتی گندم نہیں خرید رہی تھیں جس پر وزیراعلیٰ سندھ نے وزیراعظم سے درخواست کی تھی کہ پرانا گندم کا ذخیرہ ختم کرنے کے لیے 0.66 ملین ٹن گندم 50 ڈالرز فی ٹن زرتلافی پر برآمد کرنے کی اجازت دی جائے۔ سرکاری حکام کا کہنا ہے کہ مل مالکان کی جانب سے گندم درآمد کرنے کی وجہ سے گندم کی کٹائی کے موسم میں کسانوں کو مل مالکان کے ہاتھوں نقصانات سے بچانے کے لیے سندھ حکومت مجبوراً گندم برآمد کر رہی ہے۔

اقتصادی رابطہ کمیٹی کی 45 ڈالرز فی ٹن زرتلافی پر سندھ حکومت کو 400,000 ٹن گندم برآمد کرنے کی اجازت دینے سے قومی خزانے پر 18,000,000 روپے کا اضافی بوجھ پڑا۔ کمیٹی نے پنجاب حکومت کو 55 ڈالرز فی ٹن زرتلافی پر 800,000 ٹن کی گندم برآمد کرنے کی اجازت دی ہے جس کے نتیجے میں قومی خزانے پر 44,000,000 روپے کا اضافی بوجھ پڑا۔ حکام کا کہنا ہے اگر آٹا ملیں گندم درآمد نہ کرتیں تو پنجاب کا اضافی ذخیرہ سندھ میں استعمال ہوسکتا تھا۔ پنجاب اور سندھ نے بلترتیب 3.74 اور 1.21 ملین ٹن گندم کسانوں سے خریدی تھی جبکہ اس وقت ذخائر 135,000 ٹن اور 6,000 ٹن موجود تھے۔ پنجاب اور سندھ میں سال 15-2014 کا آغاز بالترتیب 3.88 ملین اور 1.28 ملین ٹن گندم سے ہوا۔ اچھی فصلوں کے باعث نجی شعبوں نے بھی براہ راست بڑی مقدار میں کاشتکاروں سے گندم خریدی۔

(دی ایکسپریس ٹریبون، 30 جنوری 2015، صفحہ 11)

چاول کا ذخیرہ PASSCO کے لیے لاکھوں کے نقصان کا سبب بن سکتا ہے

پاسکو نے 9-2008 میں خریدے گئے 1,648.75 ٹن چاول کے ذخیرے کو فروخت کرنے کے لیے چوتھی بار ٹینڈر جاری کردیا ہے۔ حکام کے مطابق پاسکو چوتھے ٹینڈر کے تحت اگر چاول 50 روپے فی کلو فروخت کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو اسے بھاری مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ اس سال منڈی میں دھان کی قیمت بہت کم ہے اور خدشہ ہے کہ پچھلے سال کے مقابلے اس سال خریدار بہت کم بولی لگائیں گے۔ پچھلے سال نومبر، دسمبر میں جاری کئے گئے ٹینڈر میں پاسکو کو 50 روپے فی کلو کی بولی موصول ہوئی جس میں چاول اُٹھانے کے لیے چھ ماہ کی مہلت کی شرط بھی تھی۔ یہ پیشکش مسترد کر دی گئی تھی اس کے بعد ادارے کے ملازمین کو اسی قیمت پر چاول فروخت کرنے کی کوشش کی گئی جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

وفاقی حکومت کی ہدایات پر پاسکو نے دھان کی قیمتوں میں استحکام لانے اور کاشتکاروں کو نقصان سے بچانے کے لیے کھلی منڈی سے چار ملین کلوگرام چاول 75 روپے فی کلو کے حساب سے خریدا تھا۔ خریدے گئے چاول کی تقریباً آدھی مقدار 10-2009 میں 75 روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کردی تھی اور باقی مقدار ھادی رائس مل میں ذخیرہ کر دی گئی تھی۔ مل مالکان نے اتنی مقدار رکھنے پر واجبات کے لیے دعویٰ کیا مگر کارپوریشن یہ ادائیگی نہیں کرسکی۔ ذخیرہ کیے گئے چاول کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر وفاقی حکومت نے گزشتہ سال نئے مینجنگ ڈائریکٹر کیپٹن ریٹائرڈ مسعود کا تقرر کیا اور انہیں ترجیحی بنیادوں پر چاول کو فروخت کرنے کا ہدف دیا گیا۔ انہوں نے مل مالکان سے مزاکرات کر کے چاول کا ذخیرہ اٹھوا کر اپریل کے آخری ہفتے میں منگا منڈی میں واقعہ کارپوریشن کے گودام میں منتقل کروا دیا۔ چاول ذخیرہ کرنے کی وجہ سے پاسکو کو لاکھوں کا نقصان ہوا جو چاول 75 روپے فی کلو خریدا گیا تھا وہ اب 45 روپے فی کلو فروخت ہو رہا ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبون، 2 فروری، صفحہ 11)

زیادہ تر درآمدی کھانوں میں حرام اجزاء

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی میں وزارت سائنس وٹیکنالوجی کے ایڈیشنل سیکریٹری میاں اعجاز نے یہ انکشاف کیا کہ ملک میں فروخت ہونے والے اکثر ڈبہ بند درآمدی کھانوں میں حرام اجزاء پائے جاتے ہیں اور وزارت کے پاس ان اشیاء کی فروخت روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ سیکریٹری نے کمیٹی کو 19 حرام اجزاء کی حامل اشاء کی فہرست پیش کی جن میں چکن ٹونائٹ کے دو برانڈ (ہالینڈ)، بلیشیس (برطانیہ)، چوپا ببل (ہالینڈ)، پاسکل یوگی کڈز (اسپین)، اسکیٹل فروٹ کے تین برانڈ (برطانیہ)، پکنک چکن (امریکہ)، سلیما سوپ (برطانیہ)، کنور چکن سوپ (فرانس)، کپ اے سوپ (برطانیہ)، ٹیولپ چکن (ڈنمارک)، رائس چکن بروکولی (امریکہ)، پاستا چکن بروکولی (امریکہ)، پاستا کریمی چکن (اامریکہ)، ہائنز ڈنر چکن (برطانیہ)، جیل-او (امریکہ)، پوپ ٹارٹس (امریکہ) شامل ہیں۔

وزارت کی طرف سے پیش کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق ان اشیاء میں لال اور سفید شراب، جیلٹن اور 120-ای (جانوروں سے تیارکردہ کھانے کا رنگ) شامل ہے اور کچھ مصنوعات مرغی کے ذبح کے طریقہ کار کے حلال اور حرام کا پتہ نہ لگنے کی وجہ سے بھی اس فہرست میں شامل کی گئی ہیں۔ ارکان کو بتایا گیا کہ وزارت چاہتی ہے کہ پاکستان حلال اتھارٹی کا قیام پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ہوتا کہ حلال مصنوعات کے کاروبار کی درآمد و برآمد کے کاروبار کو بڑھایا جا سکے۔ کابینہ اور مشترکہ مفادات کونسل میں اتھارٹی کے قیام کے لیے تیار کیا گیا مسودہ منظوری کے لیے بھیج دیا گیا ہے جس کے بعد وزارت ملک میں حرام اجزاء پر مشتمل غذائی مصنوعات کی روک تھام یقینی بنا سکے گی۔ وزارت کے حکام کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے سائنس و

ٹیکنالوجی کی طرف سے جمعیت علمائے اسلام (ف) کی رکن قومی اسمبلی شاہدہ اختر اور دیگر پارٹی اراکین کی جانب سے گزشتہ سال نومبر میں ملک میں ممنوعہ حرام اجزاء کی خرید وفروخت پر توجہ دلانے کے بعد طلب کیا گیا تھا۔

(ڈان، 24 فروری، 2015، صفحہ 2)

گزشتہ سال سندھ میں تقریباً 15 ہزار اسہال کے کیس رپورٹ ہوئے

سندھ کے متعدد اضلاع میں بچے مسلسل اسہال کا شکار ہو رہے ہیں جس میں خیر پور میرس بھی شامل ہے جہاں سے وزیر اعلیٰ سندھ رکن منتخب ہوئے مگر نکاسی کی سہولیات کو بہتر بنانے میں ناکام رہے۔ پینے کا صاف پانی اور بہتر نکاسی آب جیسی بنیادی سہولیات کی عدم دستیابی صحت کی خرابی اور اسہال کے پھیلاؤ کی وجوہات ہیں۔ صوبائی محکمہ صحت کے مطابق 2014 میں اسہال کے 150,000 سے زائد کیس رپورٹ ہوئے۔ جو پچھلے سال سے چند ہزار زیادہ تھے۔ حکام کے مطابق 2014 میں اس بیماری سے 15 افراد ہلاک ہوئے جبکہ 13 افراد 2013 میں ہلاک ہوئے تھے۔ اسہال سے متاثرہ زیادہ تر کیس تھرپارکر، میرپورخاص، حیدرآباد، بینظیر آباد اور ضلع خیرپور میرس سے رپورٹ ہوئے۔ حکام کا کہنا ہے کہ نسبتاً بہتر صفائی اور نکاسی کے انتظام کی وجہ سے کراچی میں صوبے بھر سے کم واقعات سامنے آئے۔

ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کے مطابق زیادہ تر اسہال کے کیس پچھلی گرمیوں میں رپورٹ ہوئے۔ صوبے بھر میں صرف کراچی میں پانی میں کلورین شامل کرنے اور اسے صاف کرنے کا انتظام ہے جبکہ حیدرآباد کا واحد پلانٹ غیر فعال ہے۔ سندھ کے کسی اور شہر میں ایسا کوئی پانی صاف کرنے والا پلانٹ نصب نہیں جو اس حوالے سے مددگار ثابت ہوتا۔ حکام فلٹریشن پلانٹ کی تنصیب اور شہروں سے قدیم پانی اور سیوریج لائنوں کے متبادل کی تجاویز بھیج چکے ہیں جو تاخیر کا شکار ہیں۔ حیدرآباد جو سندھ کا دوسرا بڑا شہر ہے اور میرپور خاص کو بغیر صاف کئے پانی فراہم کیا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں صحت کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور صوبائی محکمہ صحت کے بجٹ پر مسلسل اضافی بوجھ بڑھ رہا ہے۔ کئی سالوں سے حیدرآباد سے لیے گئے پانی کے نمونے یہ ظاہر کرتے رہے ہیں کہ یہ پانی انسانی استعمال کے لیے مفید نہیں۔ دنیا بھر میں نکاسی آب کی لائن اور پانی کی لائن سڑک کے مخالف اطراف میں ہوتی ہے لیکن سندھ کے ہر شہر میں دونوں لائنیں ایک ساتھ ہیں اسی وجہ سے نکاسی آب اور پینے کا پانی اکثر مل جاتا ہے اور پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں عام ہوتی ہیں۔ آلودہ پانی کے علاوہ رفع حاجت کی ناقص سہولیات بھی اسہال کی ایک اہم وجہ ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق تقریباً 2.5 بلین افراد کو بہتر رفع حاجت کی سہولت میسر نہیں اور تقریباً ایک بلین لوگ رفع حاجت کے لیے کھلی جگہ استعمال کرتے ہیں جو بیماریوں کا باعث ہیں۔ ہر سال 800,000 سے زائد پانچ سال سے کم عمر بچے اسہال کی وجہ سے موت کا شکار ہوتے ہیں۔

پاکستان میں اسہال بچوں کی اموات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ غیر جانبدار سروے کے مطابق سندھ میں اسہال کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی اموات (85 per 1,000) کی شرح بھی سب سے زیادہ ہے۔ ماہرین کے مطابق عالمی سطح پر پانچویں سالگرہ سے پہلے مرجانے والے بچوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے مگر پاکستان میں یہ شرح دو دہائی قبل کی اوسط عالمی شرح سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

(ڈان، 12 مارچ 2015، صفحہ 16)

سیمنٹ فیکٹری آلودگی پھیلا رہی ہے

کوہاٹ سیمنٹ فیکٹری کے علاقے کے رہائشیوں نے شکایت کی ہے کہ فیکٹری سے خارج ہونے والی دھول اور دھویں کے باعث سنگین بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ مقامی عمائدین پر مشتمل جرگے کے جاری کردہ بیان کے مطابق فیکٹری کی دو چمنیوں سے خارج ہونے والے دھویں سے لوگوں کی صحت کے لیے بہت سے سنگین مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ فیکٹری کے قریب پہاڑوں میں مسلسل دھماکوں کی وجہ سے مقامی لوگوں کے گھروں میں دراڑیں پڑ گئیں ہیں لیکن فیکٹری انتظامیہ ان کی شکایات سننے اور انکے گھروں کی مرمت میں مدد فراہم کرنے پر آمادہ نہیں۔ عمائدین کے مطابق فیکٹری کی انتظامیہ کو ایک معاہدے کے تحت پابند کیا گیا تھا کہ وہ مقامی لوگوں کو جگہ کا کرایہ ادا کریں گے جن کی اجتماعی زمین پر یہ فیکٹری بنی ہے۔ مگر 1992 سے ان لوگوں کو کوئی کرایہ ادا نہیں کیا گیا۔ 80 فیصد ملازمتیں مقامی لوگوں کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جس کی واضح خلاف ورزی کی گئی۔ جرگہ نے مزید کہا کہ فیکٹری پہلے بجلی پر چلتی تھی جسے اب کوئلے پر منتقل کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے فضا خطرناک حد تک آلودہ ہوگئی ہے۔

(ڈان، 12 جنوری 2015، صفحہ 7)

جنگلات اور جنگلی حیات سے متعلق قوانین کا مسودہ چار سال سے حکومت کی منظوری کا منتظر

جنگلات اور جنگلی حیات سے متعلق قوانین کا ترمیم شدہ مجوزہ مسودہ چار سال سے منظوری کا منتظر ہے لیکن بظاہر صوبائی حکومت میں اس معاملے پر سیاسی عزم کا فقدان نظر آرہا ہے۔ اس وقت سندھ وہ واحد صوبہ ہے جس نے اب تک جنگلات اور جنگلی حیات کے قوانین پر نظر ثانی نہیں کی ہے۔ صوبہ ابھی تک 87 سال پرانا قانون سندھ فورسٹ ایکٹ (کچھ تبدیلیوں کے ساتھ) اور چالیس سال پرانے سندھ وائلڈ لائف آرڈننس 1972 پر عمل کر رہا ہے۔ محکمہ جنگلات کے اعلیٰ حکام کے مطابق سندھ حکومت

کی عدم دلچسپی کا تعلق اس قانونی شق سے ہوسکتا ہے جس کے تحت جنگلات کی زمین کسی اور زمرے میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔

ترمیم شدہ فورسٹ ایکٹ 1927 میں جنگلات کی حفاظت کے لیے موثر اقدامات اور مقامی لوگوں کی شمولیت کو یقینی بنایا ہے اور ایکٹ کی تعداد میں اور قانون توڑنے والوں پر جرمانے اور سزا میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا گیا ہے۔ سیکریٹری جنگلات نائلہ واجد نے کہا ہے کہ وہ محکمہ قانون کو ایک یاد دہانی بھیج رہے ہیں تاکہ قانون کی منظوری کے عمل میں تیزی آئے۔

(ڈان، 7 جنوری 2015، صفحہ 12)

غیر موسمی بارشیں، فصلوں کی تباہی

شمالی بھارت کے دیہی علاقوں میں حکومت کے زمین سے متعلق قوانین میں تبدیلی اور غیر موسمی بارشوں کی وجہ سے سردیوں کی فصلوں کے نقصان پر کسانوں کا غصہ بڑھ رہا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کی حکومت غیر موسمی بارشوں کے اثرات سے نبرد آزما ہے جس میں کھربوں روپے کی تیار فصلیں تباہ ہوگئیں اور کسانوں کی خودکشیوں میں اضافہ ہوا۔ خودکشی کرنے والے کسانوں میں اکثر ساہوکاروں کے مقروض تھے۔ یہ ساہوکار سیاسی جماعتوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

متزلزل موسم کی وجہ سے کئی ریاستوں میں ربیع کی فصلیں، آم کی فصل اور خصوصاً گندم کی تیار فصلیں تباہ ہوچکی ہیں۔ گو کہ ابھی تک قیمتیں قابو میں ہیں لیکن حکومت پریشان ہے کہ پیداوار میں کمی رواں سال کے دوران خوراک کی قیمتوں میں اضافے کا سبب بن سکتی ہے۔

(ڈان، 27 اپریل 2015، صفحہ 5)

تبصرہ

پاکستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں کسان کی مشکلات میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ زراعت، خوراک کا شعبہ پیداوار کئی استحصالی قوتوں کا سامنا کررہا ہے۔ زراعت سے جڑے وسائل میں سب سے اہم زمین ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب تک زمین کا منصفانہ بٹوارہ نہیں ہوگا کسان مزدور آبادیوں میں امن، ترقی اور بہتر معیار زندگی ناممکن ہے۔ قانون انصاف دینے سے قاصر نظر آتا ہے۔ چاہے زمین کا ریکارڈ ہو، زمین کے بٹوارہ کے لیے عوام دوست، کسان دوست قانون سازی ہو یا گندم کی درآمد و برآمد ہر شعبہ کسی نا کسی بحران کا سامنا کررہا ہے۔ دراصل یہ بحران وسائل پر قبضہ کی جنگ کی ایک علامت ہے جو حکمران طبقہ عوام کے ساتھ لڑرہا ہے۔ ایک طرف حکمران آبادیوں کو وہ سہولیات فراہم کرنے سے انکار کررہے ہیں جو عوام کو بہتر صحت و معیار زندگی فراہم کرے۔ حکومتی سرپرستی میں سرمایہ داری کوششوں میں ہے کہ کسی طرح پیداواری وسائل پر مکمل قابض ہوجائے۔

ایک طرف موسمی تبدیلی اور خشک سالی نے نہ صرف پاکستان بلکہ آسٹریلیا جیسے ممالک کو بھی متاثر کرنا شروع کردیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں خوراک کی شدید کمی کا خطرہ ہے اور دوسری طرف حکومتی نا اہلی اور بد انتظامی کی وجہ سے گندم اور چاول سرکاری گوداموں میں سالوں سے پڑے سڑ رہے ہیں جس کی عوام تک رسائی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

بتایا یہ جاتا ہے کہ گندم کا بہت بڑا زخیرہ سرکاری گوداموں میں پڑا ہے جسے برآمد کرنا ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے بھاری زرتلافی کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ حکومتی نا اہلیوں کی وجہ سے گندم کی بھاری مقدار درآمد بھی کی جارہی ہے کیونکہ برآمد شدہ غیر معیاری گندم آٹے کے مل مالکان کو سستی پڑرہی ہے۔ حکومت کی انتظامی صلاحیتوں کا یہ عالم ہے کہ آٹے کے مل مالکان کو سرکاری گوداموں میں پڑی گندم استعمال کرنے پر بھی مجبور نہیں کرسکتی۔

یہ بدترین المیہ ہے کہ جس ملک میں سرکاری گودام چاول اور گندم کے ذخائر سے بھرے پڑے ہوں اس ملک کی آدھی آبادی غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور تھر میں معصوم بچے بھوک سے مر رہے ہیں۔ اس ملک میں گندم اور چاول کا سرکاری گوداموں میں سالوں پڑا رہنا اور سرکار کا اسے برآمد کرنے کی جستجو میں لگے رہنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ سرکار اپنی عوام کو کسی بھی قسم کی سہولیات دینے کے لیے تیار نہیں۔ ورنہ کیا یہ بہتر عمل نہ تھا کہ اضافی گندم اور چاول غریب اور بھوک سے دوچار عوام میں بانٹ دیا جاتا یا کم از کم اسے برآمد کرنے پر زرتلافی دینے کے بجائے اپنے عوام کو ہی اس چاول اور گندم پر زرتلافی دے دی جاتی۔ افسوس کہ حکمرانوں کو سوائے سرمایہ داروں، جاگیرداروں کے مفادات کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

سرکاری زرعی تعلیمی اداروں میں غیر ملکی اداروں کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کا موقع فراہم کیا جارہا ہے تاکہ عالمی سرمایہ کار منافع حاصل کرسکیں اور جینیاتی فصلوں کو فروغ حاصل ہو۔ یو ایس ایڈ جیسے ادارے، جن کا بنیادی مقصد اپنے ملک کی بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے امداد دینے والے ممالک میں منڈی کھولنا ہے۔ یہ امدادی ادارے پاکستان میں تحفظ خوراک اور زراعت کے نام پر اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرنے میں مدد فراہم کررہے ہیں اور ساتھ ہی ہمارے طالب علموں کے لیے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کررہے ہیں، کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ ایسی افسر شاہی پیدا کی جائے جو اس ملک کو بھوک، غربت اور غلامی جیسے اندوہناک مستقبل کی طرف دھکیل دیں۔